حیاتِ سعدی علیہ الرحمۃ

یعنی

شیخ مصلح الدین صاحب سعدی شیرازی

کے

حالاتِ زندگی

مؤلفہ

منشی سکندر علی خان صاحب شروانی

ہوشیارپوری

قلم الفقیر الملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر صوفی زمیندار پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات

گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور میں

باہتمام شیخ گلزار محمد چھپا

Shervani, Sikandar ʻAlī Khān

Ḥayāt-i Saʻdī
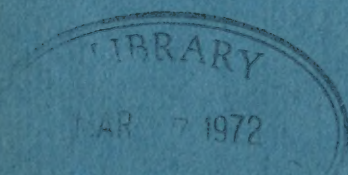
بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقدّمہ

دنیا میں بڑے بڑے بادشاہ گذرے ہیں مؤلف و مصنف موجد و صناع گذرے ہیں۔ دنیا حاتم کی سخاوت، نوشیرواں کی عدالت، سکندر کی شوکت، قاروں کی دولت پر آج تک وجد کرتی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حاتم میں سخاوت کے علاوہ عدالت کا بھی مافوق الفطرۃ مادہ تھا یا اگر نوشیرواں عدالت کیلئے مشہور ہے تو ضرور ہے کہ وہ شجاع اور علمدوست بھی ہو؟ جس طرح ایک کامیاب وکیل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ انجینیر بھی ہو اسی طرح جس قدر مشاہیر اپنے خاص اوصاف کیلئے زبان زد خاص و عوام ہیں وہ ایک وصفِ خاص ہی کے مالک تھے۔

لیکن شیخ مصلح الدّین سعدی شیرازیؒ جن کی یہ مختصر لائف آپ کے قدردان ہاتھوں میں ہے اس خصوص میں بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اگر مجلسِ تصوف میں ایک نکتہ ورصوفی اور ماہر حال وقال تھا تو

محفلِ شریعت میں متشرع عالم باعمل، وہ اخلاق کا بھی استاد تھا۔ تمدن و سیاست کا بھی بادشاہ تھا۔ انسان کو اپنی زندگی میں جس قدر منازل سے گذرنا پڑتا ہے شیخ نے سب کی رہنمائی کی ہے۔ بادشاہوں کے لئے بھی سعدیؒ کے تصرفاتِ روحی کا دروازہ کھلا ہوا ہے فقیروں کے لئے بھی اس کے پیمانۂ صبر و توکل میں شرابِ ارغوانی موجود ہے! سعدی کی زبان ہزار داستان تھی۔ اس کے گلستانِ معانی میں اخلاق و اعمال کے وہ پھول کھلے جن کی مہک آفرینی سے دنیا ہمیشہ مسرور و محفوظ رہے گی آپ کے بوستانِ خیال کی بوباس اب تک ویسی ہی دلربا ہے جیسی کہ بارھویں صدی مسیحی میں تھی! الحاصل سعدی اگر میدانِ سخن کا بادشاہ تھا تو محفلِ فقر میں متوکل فقیر، تصوف کا امام تھا، جذبات کا مصور، میدان نظم کا غازی، عرصۂ نثر کا شہسوار، بلاغت و فصاحت کا پیشوا تھا۔ ایسے ہمہ صفت موصوف بزرگ کی حیاتِ مقدس کے تذکرات جس کثرت کے ساتھ شائع ہوں باعثِ خیر و برکت ہیں۔ بنابریں ملک کو جناب فقیر الفقرا ملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر صوفی پنڈی بہاؤالدین (گجرات) کا ممنون ہونا چاہئے جن کی توجہ گرامی نے اس لائف کو مرتب کرایا ہے +

حمت پورہ ہوشیارپور
۱۵- ستمبر ۱۹۱۷ء

سکندر علی خاں شروانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیات سعدیؒ

پیدائش

ایران کی پاک سرزمین سے بڑے بڑے عالم اٹھے ہیں۔ شیراز کی قسمت میں اور بھی لازوال شہرت لکھی ہوئی تھی۔ جس کے مقدس خمیر نے اس بزم ہستی میں وہ وہ گل کھلائے جن کی بو باس سے دنیا کا بوستانِ خیال اب تک مہک رہا ہے۔ اسی گلستانِ شیراز کا مہکتا ہوا ایک پھول سعدیؒ تھا۔ جو بقول مسٹر ڈی بانسٹن الیسبری صاحب ۵۷۵ھ مطابق ۱۱۷۶ء میں غنچۂ خاموشی سے کھلا۔ آپ کا نام شرف الدین لقب مصلح الدین اور تخلص سعدی تھا۔ گو آپ شیرازی کہلائے لیکن پیدائش درحقیقت ایک قصبہ طاؤس میں ہوئی تھی۔ جو کسی زمانہ میں شیراز سے چار فرسنگ کے فاصلے پر جانب شرق واقع تھا۔ اب طاؤس

تختۂ عالم پر موجود نہیں ہے پر اس کی مقدس یادگار (سعدیؒ) قیامت تک اس کے نام کو زندہ رکھے گی۔ ابوبکر بن سعد زنگی کا زمانہ تھا کہ عرصۂ ادب و خیال میں اس نیر اعظم کا طلوع ہوا۔ روایت ہے کہ شیخ کے مولود مسعود کے وقت آپ کے والد (شیخ عبداللہ) کو خواب میں جناب خضرؑ دکھائی دیئے۔ جنہوں نے بتاکید ہدایت فرمائی کہ اس نونہال کی تربیت و تعلیم خاص ذوق و شغف کے ساتھ ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ صرف ایک معصوم بچے کی پیدائش نہیں ہے بلکہ ایک سیرۃ مقدس کا افتتاحی یوم سعید ہے۔ یہ سعدی کی پیدائش کا دن نہیں بلکہ معلم اخلاق پیغمبر سخن کی عید میلاد ہے!

شرافت نسبی

شیخ کے خاندان کے متعلق مختلف روایات ہیں بعض مؤرخین کے نزدیک آپ یمنی تھے یعنی آپ کا خاندان شہزادہ فیروز اختر کے ساتھ جب وہ عارضی طور پر ناظم اصفہان ہوکر آیا تھا شیراز آکر آباد ہوگیا جلال الدین بغدادی مصنف حالات سعدیہ کا قول ہے کہ شیخ کا خاندان در اصل مکی تھا۔ اور کہ شیخ نے خود ان سے فرمایا کہ میں مکی عرب ہوں اور میرا سلسلہ نسب رسول کریم صلعم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضؓ سے ملتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ فاطمی عرب تھے۔ بقول مصنف حالات سعدیہ شیخ کے بزرگ فاتحانِ عرب کے ساتھ اس ملک میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ چونکہ ایران کی آب و ہوا دلکشا تھی اس لئے اس کی کشش نے جذبۂ حب الوطنی سرد کردیا اور غربت پر

ایرانیت غالب آگئی۔ الغرض آپ یمنی شیخ تھے۔ پاکی اور فاطمائی سید آپ کی نجابت نسبی میں کسی کو کلام نہیں ہے۔

پرورش و تربیت

شیخ کے والد (عبداللہ) پر مولویت کا رنگ غالب تھا۔ آپ کی متشرع طبیعت نے اپنے سعادت مند فرزند کو نہایت محتاط بنا دیا تھا۔ آپ کے والد کی دینداری اور تقویٰ کا سب کو اعتراف ہے بچپن میں ہی دین و ایمان کے مسائل سعدیؒ کو ازبر کرا دیئے گئے تھے۔ بچپن کی تربیت نہایت ہی نازک منزل ہے۔ کیونکہ طبیعت نوخیز ہوتی ہے۔ اور مزاج تاثیر پذیر۔ دانا باپ نے ان سب مشکلات کو مدنظر رکھکر اپنے ہونہار فرزند کو اپنی ہی صحبت میں رکھا۔ شیخ عبداللہ نہایت ہی محتاط متشرع تھے۔ آپ تنگ مزاج بھی تھے۔ اسی لیئے آپ کا احتساب سخت تھا۔ سعدیؒ نے اپنی ابتدائی تربیت کا بوستاں میں بھی ذکر فرمایا ہے ؎

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت | نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت
بخردی بخورد از بزرگاں قفا | خدا دادش اندر بزرگی صفا

مگر شیخ سعدی کا شفیق معلم اور حقیقی غمگسار باپ جلد ہی داغ فراق دے گیا۔ شیخ عبداللہ شیرازی کے مرنے کے بعد ان کے ماموں علامہ قطب الدین شیرازی نے جو محقق طوسی کا شاگرد رشید اور ہولاخاں کا مصاحب خاص تھا سعدی کی پرورش کا بیڑا اٹھایا۔ بعض مؤرخین اس سے منکر ہیں اور لکھتے ہیں کہ والد کی وفات کے بعد

بیوہ ماں نے ہی پرورش کی۔ شیخ کی والدہ (فاطمہ) ایران کے ایک رئیس کی صاحبزادی تھیں۔ اور بڑی ہی لائق پاکباز تھیں۔ سعدی ان کی حد سے زیادہ تعظیم کیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ "اماں جان! میں وہی ہوں جو تمہاری آغوش میں بیچاروں کی طرح پڑا رہا کرتا تھا۔ اور تم مجھے تھپک کر سُلایا کرتی تھیں"۔ آپ کی والدہ درویش مزاج پابند شریعت تھیں۔ شیخ کو فرائض دینی کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی ہدایت فرمایا کرتی تھیں۔ شیخ کی فطرت صالح کی اس ابتدائی تربیت کا نقش ساری عمر قائم رہا۔ اور زمانہ کے مخالف تاثرات ہمیشہ اس نیک مرد سے مایوس رہے!

مصلح الدین نامی ایک بزرگ اُس زمانہ میں علم و فضل کے آفتاب تھے۔ شیخ کے والد عبداللہ نے اپنے فرزند سعید سعدی کو بھی اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور جناب مصلح الدین قبلہ سعدی کے حال پر نہایت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ شیخ نے قرآن مجید انہیں سے پڑھکر حفظ کیا تھا۔ آپ نے پہلے دن ہی سعدی کو گود میں لیکر کہدیا تھا کہ "جیسا اس بچے کا ظاہر خوبصورت ہے ویسا ہی باطن بھی نورانی و روشن ہے"۔ پیر کامل کے یہ ملہمانہ کلمات تھے۔ جن پر شیخ کی حیات مابعد نے صداقت کی مہر لگادی، ڈی جانسٹن الیسبری صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ کا بچپن ہومر شاعر کے بچپن سے مشابہ تھا۔ اور قدرت نے ان دونا موروں کی سرشت میں کچھ ایسی مناسبت رکھدی ہے کہ ان کا طرز کلام اور مذاق سخن بھی ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ جلال الدین بغدادی نے شیخ کی بچپن کی نسبت لکھا ہے کہ اس کے عادات بچپن ہی

سے محتاط اور درست تھیں۔ وہ عام بچّوں کی طرح کبھی ضد یا خفیف حرکات نہ کرتا تھا۔ اس کی تمام باتیں خوش آیندہ معلوم ہوتی تھیں۔ اور لوگ اس کو محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ شیخ بچپن ہی سے حاضر جواب تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے اس کو اپنے باپ کے ساتھ سعد زنگی کے دربار میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سعد نے اس ہونہار بچے سے دریافت کیا کہ میاں بتاؤ تمہاری عمر کیا ہے؟ سعدی نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ حضور کی پُرشوکت سلطنت اور سربسز راج سے پورے بارہ برس چھوٹا ہوں۔ سعد زنگی اس ذہانت و متانت سے بیحد محفوظ ہوا۔ اور عبداللہ سے کہا کہ اس سعید اور نیک بخت بچے کی پرورش اچھی طرح کرو کیونکہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ ایک عالم اس کی نطقِ کمال پر حسنِ عقیدت کے پھول نثار کرے گا۔ بقائے دوام اس کے گھر کا غلام ہوگا!

شیخ نے جب ذرا ہوش سنبھالا تو تحصیل علوم دنیوی کا فکر دامنگیر ہوا۔ علم کیلئے سچّی تڑپ تھی۔ حافظہ غضب کا تھا جو بات سُن لیتے وہ ہمیشہ کیلئے نقشِ ذہن کر لیتے۔ اُس زمانہ میں جس قدر فضلائے روزگار تھے سب کی صحبت اختیار کی۔ جودت طبع وہ زیور ہے جو اساتذہ کو خود بخود ملتفت کر لیتا ہے۔ چنانچہ شیراز کے سب فاضل ادیب شیخ کو پیار کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ شیخ نے ارادہ کیا تھا کہ مدرسہ عقیدیہ میں سلسلہ تعلیم و تلمیذ شروع کروں یہ مدرسہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کر رکھا تھا۔ اور طرزِ تعلیم اس کا معقول تھا لیکن شیخ کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ کیونکہ سعد زنگی اُس زمانہ میں عراق کے حدود پر لشکر کشی کر رہا تھا

غیاث الدین بلبن نے میدان خالی پاکر شیراز کی اینٹ سے اینٹ بجادی شیراز کی عالمگیر تباہی کا شیخ کے دل پر بھی گہرا اثر پڑا۔ آپ نے فیصلہ کرلیا کہ ایسی بدامنی کی حالت میں یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اور بہتر یہی ہے کہ بغرض تحصیل علوم ہجرت کی جاوے!

شیخ کی سرشت میں حُب الوطنی کا جذبہ بھی تھا۔ آپ کا صحیح قول ہے "حُب وطن از ملک سلیمان خوشتر"۔ اس لئے فراقِ شیراز ناگوار بھی گذرا ہوگا ایک طرف وطن کی الفت تھی دوسری طرف علم کا سچا عشق تھا جو آخر کار حُب الوطن پر غالب آگیا اور آپ نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھتے ہوئے "بغداد" کی راہ لی ؎

دلم از صحبت شیراز بکلّی بگرفت	وقت کہ پرسی خبر از بغداد م
سعدیا حب وطن گرچہ حدیثیست صحیح	نتواں مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

آپ نے شیراز کو سلام کیا۔ آپ کی جائداد صرف کتابوں کا ایک بستہ تھا جس کو آپ ہفت اقلیم کی شہنشاہی سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ اسی بستہ میں وہ قرآن شریف بھی تھا جو مولانا مصلح الدین قبیا نے آپ کو دیا تھا۔ اور وصیت کی تھی کہ اس کو میری یادگار سمجھنا۔ اور کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کرنا۔ یہ مصحف حمید چمڑے پر سنہری حروف سے لکھا ہوا تھا جس قافلہ کے ساتھ شیخ علیہ الرحمۃ قطع منازل کرنے کا ارادہ کرچکے تھے۔ اس کی ایک منزل پر ہی علیحدہ ہوگئے کیونکہ شیخ کو ایک سخت مرض نے آدبایا جس سے آپ گیارہ روز تک بیہوش رہے۔ شیخ کی تیمارداری گاؤں کی ایک عورت کرتی تھی گو معالجہ کا پیمانہ ٹھیک نہیں تھا پر شفامن جانب اللہ ہوتی ہے آپ بفضلہ تندرست ہوگئے۔ سعدی گاؤں سے رخصت ہوکر

تھوڑی دور گئے تھے کہ سامنے سے ایک گروہ قزاقوں کا نمودار ہوا۔ اور آپ کو گھیر لیا کہا کہ جو کچھ پاس رکھتے ہو حوالے کر دو۔ شیخ کے پاس توکل کی دولت کے سوا صرف ایک بستہ تھا وہی سامنے رکھ دیا۔ اور کہا کہ میں طالب علم ہوں میرا تو یہی اندوختہ ہے اشیخ کا طرزِ کلام اپنا کام کر گیا۔ رہزنوں کو اس سحر طرازی نے موہ لیا۔ بجائے قزاقی کے سواری کو ایک خچر ملی۔ اور ایک یادو بدرقہ رہنمائی کیلئے ملے!

جب شیخ یکہ و تنہا بے یار و مددگار شیراز سے رخصت ہو کر بغداد پہنچے تو اپنا نصب العین علم اور صرف تحصیل علم مقرر کیا نہ کسی سے واسطہ نہ غرض، کتاب کے ورق، ورقوں کے حرف ان کے ہم جلیس و رفیق تھے مسائل و مناظر، لطائف و حقائق کے مباحث ان کی تفریح دن رات علم کی دُھن تھی۔ علم کا ہی عشق تھا صحیفۂ قدرت کو خوب دل کی آنکھوں سے مطالعہ کیا۔ جن حقائق و معارف پر پردہ پڑا ہوا تھا وہ آپ کی زیرکی نے بر سرِ عام لا کھڑے کئے۔ بغداد کا مدرسہ نظامیہ اُس زمانے کی کیمبرج یا آکسفورڈ یونیورسٹی تھی۔ یہ مدرسہ خواجہ نظام الملک طوسی نے سنہ ۴۵۹ھ میں بنوایا تھا۔ اس کی شہرت عالمگیر تھی۔ جو شخص اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتا تھا وہ دنیا کے ہر ایک حصے میں مستند عالم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے فیضان علم کا دور نزدیک شہرہ تھا۔ مدرسہ نظامیہ میں اہل شیراز کی خاص رعایت ملحوظ رکھی جاتی تھی کیونکہ اس کا پہلا متولی ابواسحٰق شیرازی تھا یہ رعایت شیخ کے حق میں از بس مفید ہوئی اور وہ اسی مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ شیخ چونکہ قدرتاً ذہین تھے اس لئے مہینوں میں وہ کام کیا جو

کوئی اور شخص برسوں میں مشکل کر سکتا۔ شیخ کو بچپن سے شب بیداری کی عادت تھی۔ دن رات میں مشکل تین گھنٹہ سوتا تھا۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مشغول رہتا تھا۔ اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے پڑھا کرتے، علم کا شوق نہیں عشق تھا جیسا کہ خود لکھا ہے ؎

پیئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

جب اُستادوں نے شیخ کی روزافزوں ترقی، محنت اور فہانت دیکھی تو وہ ان کی طرف خاص توجہ کرنے لگے اور مدرسہ کے متولی نے (جس کو شیرازیوں سے خاص اُنس تھا) آپ کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا مدرسہ نظامیہ میں اس وقت حدیث اور تفسیر کے پروفیسر علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی تھے آپ شیخ پر خاص لطف فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "سعدی آسمانِ شہرت و کمال کا شمسِ تاباں ہوگا" ابن جوزی کی مقدس صحبت سے شیخ نے بہت فائدہ اُٹھایا صحبتِ نیک کے اثر کو آپ نے گلستان میں بھی بیان کیا ہے ؎

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

شیخ ۱۱۹۶ء میں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوا۔ اور قریباً تیس سال تک وہاں علم و قلم کی صحبتیں گرم رہیں ۱۲۲۴ء میں فضیلت کی دستار زیبِ سر کر کے رخصت ہوا۔ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ بڑے بڑے لائق فائق تعلیم پا چکے تھے مثلاً امام ابوحامد غزالی، شیخ عبدالقادر شہروردی۔ عمادالدین موصلی وغیرہ وغیرہ مگر جو قبولیت شیخ سعدی کے کلام کو اور جو شہرت اس منتخب روزگار کے نام کو نصیب ہوئی وہ

آج تک کسی مصنف کو میسر نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں بچہ بچہ
شیخ مرحوم کے نام اور کلام سے واقف ہے۔ اور یورپ کی کوئی
زبان ایسی نہیں جس میں شیخ کا کلام ترجمہ ہو کر شائع نہ ہوا ہو۔ کہتے
ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں شیخ نے اپنا دستور العمل نہایت ہی
مقدس اور برتر رکھا تھا۔ یعنی جب آپ مدرسہ سے رخصت ہوئے
ہیں تو آپ کی عمر پچاس سال کی ہو چکی تھی اور اس وقت تک آپ
مجرد تھے۔ نفسانی خواہشات سے آپ کو سخت پرہیز تھا۔ اسی تقویٰ
کی بدولت آپ نے عمر طبعی حاصل کی۔ بڑھاپے میں بھی آپ کے
قوے مضبوط تھے۔ زمانہ کے انقلاب دیکھو ایک تو شیخ کا وقت
تھا کہ سعید الفطرۃ بزرگ علم کے حقیقی نور کی تلاش میں نصف صدی
تک لذائذ نفس سے نفرت کرتے تھے ایک یہ زمانہ ہے کہ پچاس
سال تک عمر کا سرمایہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جب ہمارا بچپن ہی کثیف
و غلیظ ہو رہا ہے۔ تو ہم علم کیا خاک حاصل کر سکتے ہیں۔ اور عمر طبعی
تک کب پہنچ سکتے ہیں؟ یہ سب کچھ روحانیت کے سقوط کا نتیجہ ہے
نفسانیت کے غلبہ نے پاکیزگی اور تقویٰ کو برباد کر دیا ہے۔ اس
خصوص میں بھی "حیات سعدی" جنس جدید کے حق میں خضر راہ کا
کام دے سکتی ہے *

حلیہ۔ استعداد علمی۔ عادات طبعی

شیخ دراز قامت، صحیح المزاج، قوی اور جفاکش تھے۔ آپ کا
سر بہت بڑا تھا، پیشانی فراخ تھی۔ اور اس پر زیرکی اور نیک بختی کا

آفتاب جلوہ افروز تھا۔ رنگ سُرخ و سفید تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی
تھیں۔ ریش مبارک مشبہ اور مونچھیں گھنی اور لمبی لمبی تھیں۔ آپ کے
چہرے سے جلال اور تمکنت ظاہر ہوتی تھی۔ اور بشرے سے رعب
داب برستا تھا۔ شیخ کا سینہ بہت فراخ تھا۔ جو علوم معرفت حقائق
ولطائف سے معمور تھا۔ اسی مقدس سینہ میں علم و اخلاق کی وہ امانت
تھی جو قسام ازل نے اسی سینے کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ آپ قدیم
ایرانیوں سے ملتا جلتا لباس پہنا کرتے تھے۔ سر پر کلاہ پیچاں یا بھاری
عمامہ، گلے میں عربی یا ایرانی جُبہ، اور پاؤں میں شرعی پاجامہ لیکن حقیقتاً
شیخ کا کوئی مخصوص لباس نہیں تھا۔ کبھی آپ رومی کپڑے پہن لیتے تھے
کبھی یونانی ڈریس، آپ کا قول تھا کہ "درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار"
شیخ چونکہ اکثر سیر و سیاحت میں زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ایک
ہاتھ میں کشکول اور دوسرے ہاتھ میں تبر بھی رکھتے تھے۔ شیخ کی حیات
مختلف جذبات و اعمال کا مجموعہ تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں شیخ کی
واحد ذات میں حیات انسانی کے جملہ اوصاف موجود تھے۔ کبھی تو وہ فقرا
اور مشائخ کے حلقوں میں معتکف نظر آتے تھے اور کبھی بادشاہوں کے
درباروں میں نکتہ نوازی کرتے دیکھے جاتے تھے۔ کبھی وہ احرار و ابرار
کی صحبتوں سے بہرہ اندوز ہوتے تھے اور کبھی رندوں اور بدمستوں کے
گروہ کی پیشوائی کیا کرتے تھے۔ میخانوں میں اور بتکدوں میں یکساں مظاہر
قدرت کا مشاہدہ کیا کرتے۔ بت خانوں میں جاکر صنم حقیقی کی پوجا کرتے۔ اگر
ایک وقت میں جامع بعلبک شیخ کے مواعظ کا لطف اٹھا رہی تھی
تو دوسرے فرصت میں سومنات کی زمین بھی آپ کے ورود سے مسرور

دکھائی دے رہی تھی۔ فلسطین کی بستیاں، بصرہ کے نخلستان، سب کے سب زیر گشت تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے علم تصوف شیخ شہاب الدین سہروردی سے حاصل کیا تھا۔ حلقۂ صوفیائے کرام میں آپ کے مقالات کی خاص عزت کیجاتی ہے۔ ایک روز کسی نے پوچھا کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے؟ شیخ نے جواب دیا کہ اس سے پہلے تو اس گروہ کا ظاہر پریشان، اور باطن مطمئن تھا اور اب اس کی حقیقت یہ ہے کہ ظاہر جمع اور باطن منتشر۔ شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمۃ فاضل صوفی بزرگ تھے۔ سنہ ۱۲۳۴ء میں آپ کا وصال ہوا۔ سعدیؒ پر اس حلت کا نہایت ہی گہرا اثر پڑا۔ کیونکہ اب کوئی ایسا مرد اجل نظر نہیں آتا تھا جو بیاد لہ خیالات کے قابل ہو۔ شیخ سعدیؒ چونکہ شب بیدار اور صائم نیکوکار تھے اس لئے کھانا بہت کم کھایا کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپ کی صحت بھی ہمیشہ اچھی رہی۔ شیخ سعدیؒ ایک بہت بڑے معلم اخلاق و اعمال محتسب روزگار گذرے ہیں۔ آپ نے راہ دعوت کے مقابلہ میں سب کچھ ہیچ سمجھا۔ آپ کی مقدس سیرۃ کا ہر ایک لمحہ دعوت کے لئے وقف تھا۔ حریت نفس نے آپ کو مداہنت کی نمبر سے ہمیشہ بیزار رکھا۔ وہ جس بستی کے ساتھ عوام سے ہمکلام ہوتے تھے اسی بیباکی کے ساتھ بادشاہوں کا نقد و احتساب کرتے تھے۔ خلق خدا کی بھلائی آپ کا کعبۂ مقصود تھا۔ ابنائے جنس کی ہمدردی آپ کا نصب العین تھا۔ ہمیشہ آپ ظلم و طغیان کے خلاف جہاد کیا کرتے تھے۔ استقلال آپ کا بےمثال تھا جرأت و بیباکی ضرب المثال تھی۔ بادشاہوں کو ہمیشہ کھری کھری سنا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے آپ سے دعائے خیر کی التجا کی

آپ نے بے تکلف فرمایا کہ تیرے حق میں دو پہر تک خواب آلود رہنا افضل ہے تاکہ اتنی مدت تک تو خلقِ خدا تیرے جور و ستم سے محفوظ رہے۔ آپ نے حوادثِ روزگار کا خوب ہی تجربہ کیا تھا۔ آپ کی عمر مختلف واقعات میں سے گذرتی رہی۔ آپ نے بادشاہوں کی مجلسیں دیکھیں۔ فقراء کی صحبتیں دیکھیں۔ عالموں اور حکیموں سے سلسلہ سلام و پیام جاری رہا ساری دنیا کے چکر لگائے۔ عجائب روزگار مشاہدہ میں آئے۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے لاکھوں بنے۔ ہزاروں بگڑے۔ بہت سے انقلاب آنکھوں نے دیکھے۔ خاندان کردیہ کا چراغ آپ کے سامنے گُل ہُوا۔ سلجوق اور خوازم کی آویزش آپ نے دیکھی۔ تاتاریوں کی شوکت اور خوارزمیوں کی ہزیمت کا نقشہ آپ نے دیکھا۔ دمشق۔ اسکندریہ اور مصر کے خوفناک قحط میں بھی آپ نے فاقہ مستی کا لطف اُٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں شاندار اصلیت اور بے مثال تاثیر ہے۔ شاعر کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ ضروری ہوتا ہے۔ جس سخنور نے کبھی معشوق کی کمر نہ دیکھی ہو وہ اس کی لطافت کی کیا تشریح کر سکتا ہے۔ اسی طرح جس غریب شاعر کا گذر کبھی صاحب ضلع کی کچہری میں بھی نہ ہوا ہو وہ دربار شہنشاہی کی کیا تصویر کھینچ سکتا ہے؟ دبیر و انیس کا کلام اسی لئے دلگداز اور پرسوز ہے کہ ان کا دخل دربار واجد شاہی میں تھا۔ اور وہ نوابی بانکوں کو اسلحہ سے مسلح ہوتے دیکھا کرتے تھے۔ ہمارے شعراء کا کلام زیادہ تر اسی لئے روکھا پھیکا اور بے اثر ہے کہ ان کو مظاہرِ قدرت کے مشاہدہ کا موقعہ نہیں ملتا۔ برخلاف اس کے سعدیؒ دنیا کا وہ ہمہ گیر نقاد و ناظر تھا جس کی نظر انتقاد و احتساب سے اس نظامِ ہستی کی کوئی لائن بھی

محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کے ولولہ سیاحت نے اس کے لئے بغداد و دمشق کی گلیاں اور سومنات کے کوچے یکساں کر دیئے تھے۔ وہ صحیفۂ فطرۃ کا مطالعہ دل کی آنکھوں سے کرتا تھا۔ اور سب مظاہر کی تصویر کھینچ دیتا تھا۔ مظاہر قدرت کا اعلیٰ مصوّر تھا۔ نفس انسان کے مختلف تاثرات کی اس صفائی کے ساتھ تصویر کھینچتا تھا کہ مانی و بہزاد کی روح وجد میں آ جائے۔ ہمارے شعرا کے مذاق سلیم کو سعدی کے ہمہ گیر خوانِ کرم سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

سعدی میں ایثار و خلوص کے اوصاف نہایت ہی نمایاں تھے آپ کو ایک دردمند دل اور سلیم قلب ملا تھا۔ جو ہم جنس افراد کی مصیبت کے احساس سے ہر وقت تلملایا کرتا تھا۔ اخوت کا ایک ہمہ گیر نصب العین آپ کے پیش نظر تھا۔ آپ اس عرصۂ عالم کے سب افراد کو بھائی بھائی سمجھتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ خلقتِ خدا بحیثیت مجموعی ایک جسم ہے اور مختلف فرقے اس جسم کے اعضا ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگرند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — نماند دگر عضوہا را قرار
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

آج اس جذبۂ اخوت کی ابنائے ملت کو کس قدر شدید ضرورت ہے؟ اسی خلوص کے قحط نے فضائل و اخلاق کا ستیاناس کر دیا ہے۔ غرور و تکبر نے شیشۂ خلوص کو چور چور کر دیا ہے۔ امیر اپنی نظر میں غریبوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور غریب امیروں کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ مادی آب و تاب کے نشے میں سب بدمست ہیں۔ روحانیت کا

ان پلید ہستیوں میں ذرا بھی نشان نہیں ملتا۔ شیخ کی طبیعت میں انکساری بے انتہا تھی۔ انکساری کے دوش بدوش خودداری بھی تھی۔ اور یہ لازمۂ بشریت بھی ہے کہ انسان عزتِ نفس سے بھی غافل نہ ہو۔ اسی لئے سعدی میں حفظ مراتب اور وضعداری کے نمایاں اوصاف موجود تھے شیخ اسکندریہ میں تھے کہ سخت قحط پڑ گیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ایک ایک نان ہزار ہزار محنت سے بھی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ شیخ بھی اس بلائے قحط سے محفوظ نہیں تھے۔ اسی شہر میں ایک خواجہ سرا نے خیرات وزکوٰۃ کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ اس کے ہاں ہزاروں دیسی بھوکے پیاسے کھانا کھایا کرتے تھے۔ سعدی کے چند دوستوں نے کہا کہ چلو آپ کو بھی اُس مخنثے کی دعوت میں لے چلیں مگر شیخ نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ شیر اگر بھوک سے مر بھی جائے تو بھی کُتّے کا جھوٹا نہیں کھا سکتا +

اس سے آپ کے توکّل کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ باوجود غربت و افلاس میں گرفتار ہونے کے دل ہمیشہ غنی رہا۔ اور محض شکم پرُی کے لئے کسی کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ سعدی علیہ الرحمۃ حُسن پرست بھی تھے۔ وہ خالقِ اکبر کی ان بدیع المثال مینا کاریوں سے سچا عشق رکھتے تھے۔ اور اچھی شکل والوں سے بے حد محبت کیا کرتے تھے۔ خوبصورتی انسان کا ایک زیور ہے۔ اور اللہ میاں کی صفت و شانِ محبوبی کی دلرُبا جھلک۔ پس اگر سعدی خوبصورتی پر مرتا تھا تو درحقیقت اپنے صانع ازلی پر فریفتہ تھا۔ وہ تصویر دیکھکر مصوّر پر عاشق ہوتا تھا وہ انجن کا مشاہدہ محض انجینر کی یاد میں کرتا تھا۔ وہ صراحئ گُل کو اس لئے

پیار نہیں کرتا تھا کہ یہ مٹی کی مورت ہے بلکہ وہ اس کے پردے ہیں اس کے بنانے والے کمہار کی پوجا کرتا تھا۔ جب تم جنگل کے ہر ایک درخت، پہاڑ کے ہر ایک پتھر، دریا کی ہر ایک موج، ریگستان کے ہر ایک ذرّے، آبشار کے ہر ایک قطرے، نخلستان کے ہر ایک چشمے سے محبت کرتے ہو محض اس لئے کہ ان کا موجد و محافظ ہمارا محبوب ہے تو جاندار ہستیوں کی خوبصورتی پر مر مٹنا بھی کیونکر ناروا ہو سکتا ہے؟ جبکہ مقصود اس سے بھی مولا ہی کی پرستش ہے؟ لیکن سب لوگ سعدی نہیں بن سکتے، سعدی، سعدی ہی تھا۔ سعدی اگر حسن پرست تھا تو اس کی تہ میں بھی حسن ازل کا جلوہ تھا۔ آج سعدی کی حسن پرستی کی تقلید تو کی جاتی ہے پر شاہدِ ازل سے بے نیازی ہے! سعدی (جو قدرت کا ایک عجائب روزگار اور مجامع اوصاف بندہ تھا) ظرافت و حاضر جوابی کے اوصاف سے بھی محروم نہیں تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دوست راستہ میں ملے۔ اور شکایت کرنے لگے کہ مدت مدید سے نہ رُسل و کتابت کا سلسلہ جاری ہے نہ جمال سے شرف اندوز ہو سکا ہوں۔ آخر وجہ کیا ہے؟ شیخ نے بے تکلف کہا کہ قاصد اس لئے نہ بھیجا کہ دیرا رشک مانع تھا۔ وہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ قاصد تو آپ کے دیدار سے فیضیاب ہو اور میں محروم رہوں! شیخ سعدی پر استقلال تو گویا ختم تھا۔ آپ پر مختلف کیفیتیں وارد ہوا کرتی تھیں کبھی تو آپ امرا و مشائخ کی صحبتوں میں ضیافتوں کا لطف اُٹھایا کرتے تھے اور کبھی فاقہ مستی کے دن آجایا کرتے تھے۔ لیکن آپ کے لئے یہ سب کیفیتیں یکساں تھیں۔ وہ نہ تو شاہی درباروں میں اپنا توکل و رضا چھوڑتے تھے اور نہ فقر و بے نوائی میں صبر و توکل سے مُنہ موڑتے تھے۔ آپ کا ضمیر

ایک کوہِ راسخ تھا جس پر زمانہ کے تغیرات و انقلابات سر ٹپکتے تھے اور پاش پاش ہو جاتے تھے پر شیخ کے ضمیر کو جنبش نہیں دے سکتے تھے ایسے پاکیزہ استقلال کے بندے اب کہیں نظر نہیں آتے۔ آجکل تو جذبہ بہ قدر کمزور ہو گیا ہے کہ اگر ایک آقا چند روز کے لئے کسی ہم جلیس کو مجلس پر کر دے تو وہ اس صدمہ کی تاب نہ لاتا ہوا فنا ہی ہو جاتا ہے مگر خلاف اس کے سعدی کا دل گر وہ بادشاہوں کے وصال و فراق سے بھی متاثر نہیں ہوتا تھا۔ معاملات میں آپ کے دلائل نہایت وزندار اور دل آویز ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شیخ کا ایک محفل میں گذر ہوا۔ وہاں ایک شخص جو بظاہر درویش معلوم ہوتا تھا۔ امیروں کی مذمت کر رہا تھا۔ اور جوش میں کہہ رہا تھا۔ کہ فقیروں میں وسعت نہیں۔ اور امیروں میں حوصلہ نہیں سے

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

شیخ کو یہ یکطرفہ فیصلہ کچھ ناگوار گزرا اور آپ نے وہیں طرح جنگ ڈال دی۔ اس درویش سے جو بحث ہوئی اس کو سعدی اپنے اندازِ خاص میں اس طرح بیان کرتے ہیں ”میں چونکہ خداوندانِ نعمت کا نمک پروردہ تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا بابا! تو یہ کیسی بیہودہ تقریر کرتا ہے۔ دولتمند اگر سچ پوچھو تو قبلۂ حاجات ہیں۔ غریبوں کی روزی ہیں۔ گوشہ نشینوں کا رزق ہیں۔ مسافروں اور بیکسوں کے دلی نعمت ہیں۔ یہ وہ نیک بخت اور ایثار بزرگ ہیں۔ جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ پہلے اوروں کو کھلاتے ہیں۔ اور پھر آپ کھاتے ہیں۔ بیوہ عورتیں

یتیم بچے، ضعیف، مقطوع الاعضا، اندھے، لنگڑے، لولے، رشتہ دار،
ہمسائے یہ سب کے سب امیروں ہی کے خوانِ کرم سے مستفیض ہوتے
ہیں۔ جس قدر اوقاف ہیں سب کے سب امیروں ہی کے خیر و کرم کے
منت گذار ہیں۔ سرائے، مسجدیں، یتیم خانے، مدرسے، خانقاہیں،
پل وغیرہ دولتمندوں ہی کا نشان ہیں۔ ان کے مقابلے میں تم درویشوں کو
پیش کرتے ہو جو بدقت تمام صرف نماز کی دو رکعتیں ادا کر سکتے ہیں

توانگراں را وقف است نذر و مہمانی ... زکوٰۃ و فطرت و اعتاق و ہدیہ و قربانی
تو کے بمنزلِ ایشاں رسی کہ نتوانی ... بجز دو رکعت و آں ہم بصد پریشانی

اگر کوئی خیرات و بخشش پر قادر ہے تو وہ امیر ہے۔ اگر طاقت
و عبادت ہے تو امیروں کی ہے۔ کیوں؟ ان کا مال پاکیزہ، ان کا
لباس پاکیزہ، ان کی رفتار گفتار پاکیزہ، عبادت کا لطف تبھی ہی
ہے کہ سب کچھ پاکیزہ ہو، اور جمعیت خاطر حاصل، پراگندگی اور انتشار
کبھی حضور قلب سے سرفراز نہیں ہونے دیتا۔ جس کا پیٹ ہی خالی ہو،
وہ عبادت کیا کر سکتا ہے؟ اور اس کا دل عبادت میں کیا خاک لگتا
ہے؟ جو خود تہیدست ہو وہ مروت کس برتے پر کر سکتا ہے؟ جو
مفلس و قلاش ہو وہ خیرات کے ثواب سے کیسے بہرہ اندوز ہو سکتا
ہے؟ تم نے دیکھا ہوگا کہ جس شخص کو صبح کی روزی کا فکر دامنگیر ہو وہ
رات کو پراگندہ خاطر رہتا ہے۔ چیونٹی تمام گرمی کے موسم میں جمع کرتی رہتی
ہے، تاکہ جاڑے میں فراغت سے کھائے۔ فراغت کو فاقہ سے کیا
نسبت؟ اور جمعیت کو تنگدستی سے کیا مشابہت؟ جس وقت دولتمند
عشا کی نماز کی نیت باندھتے ہیں اُس وقت درویش بیچارے اِس

امید میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یا الٰہی کہیں سے شام کا کھانا آوے!
صاحب مال ذکرِ خدا میں مشغول ہوتا ہے اور وہ بیچارہ بھوکا پریشان
دل بیٹھا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دولتمندوں کی عبادت زیادہ تر مقبول
ہوتی ہے کیونکہ ان کو جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے ؎

خداوند روزی بحق مشتغل — پراگندہ روزی پراگندہ دل

"الفقر سواد الوجہ فی الدارین" یعنی فقیری دو جہان کی
روسیاہی ہے۔ درویش نے جواب دیا کہ یہ حدیث تو سنائی مگر وہ بھی
سنائیے "الفقر فخری" یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ فقر میرا فخر ہے
میں نے کہا کہ بس معاف رکھئے حضرت کا اشارہ اُس فرقہ کے فقر
کی طرف ہے جو رضا کے مرد میدان ہیں۔ جو تیر قضا کے لئے ڈھال
ہیں۔ نہ کہ ان شخصوں کی طرف جو بزرگوں کی گودڑی کا حیلہ بناتے ہیں ؎

اے طبل بلند بانگ در باطن ہیچ — بے توشہ چہ تدبیر کنی وقت بسیچ
روئے طمع از خلق بہ پیچ ار مردی — تسبیح ہزار دانہ بر دست مپیچ

درویش جس کو معرفت کے نور سے مس نہیں ہوتا ہے ایسے
افعال کرتا ہے جو کفر کی حد تک پہنچتے ہیں۔ بھلا جو شخص خود برہنہ
تن ہے وہ دوسروں کو کب کپڑے پہنا سکتا ہے؟ جو خود فاقوں سے
بے حال ہے وہ بھوکوں کو کیا کھلا سکتا ہے؟ اور جو تنگدست ہے جو
فاقہ مست ہے وہ دوسروں کی کیا اعانت کر سکتا ہے۔ جب حقیقت
حال یہ ہے تو بھلا ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ؟ آپ کی تو وہ مثل ہوئی کہ
بلی کے خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں ؎

تشنگاں را نماید اندر خواب — ہمہ عالم بچشم چشمہ آب

شیخ لکھتے ہیں کہ میری یہ تقریر سُنکر درویش جامے سے باہر ہو گیا۔ اور برافروختہ ہوکر کلمات نازیبا مُنہ سے نکالنے لگا اور کہنے لگا کہ تم نے تو دولتمندوں کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ تم نے حد سے زیادہ مبالغہ کیا ہے۔ تم دولتمندوں کو ہی سارے زمانے کے فضائل و اخلاق اور رزق کا مالک سمجھتے ہو۔ شاید تم نے اسی صداقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ سارے زمانے کے غرور و تکبر کے بھی یہی دولتمند مالک ہوتے ہیں۔ ان کی بات بات سے نفرت ٹپکتی ہے۔ یہ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی دولت پہ نازاں رہتے ہیں۔ امارت و حشمت کا خمار ان کو بدمست کر دیتا ہے بے انتہا ظلم و ستم کرتے ہیں۔ عالموں کو بھی حقارت سے قل اعوذ ئیے کہتے ہیں۔ فقرا کو کنگال کہتے ہیں۔ اپنی دولت کو دائمی سمجھتے ہیں حالانکہ دنیاوی شوکت بالکل ہی عارضی شے ہے۔ اگر آج ایک شخص دولت و حشمت کے آسمان پر مہر منیر ہے تو کل فقر و ذلت کے میدان میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ جب تمہاری محبوب دولت کا یہ حال ہے تو اس قدر تحمید و تقدیس کے کیا معنے۔ امیر داناؤں کے اقوال کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ جنہوں نے کہا ہے کہ جو شخص عبادت کی دولت سے محروم ہے۔ اور دنیاوی دولت سے مالامال ہے وہ ظاہر میں دولتمند ہے اور باطن میں فقیر ہے

گر بے ہنر بمال کند کبر بر حکیم کون خرش شمار اگر گاو عنبرست

ہیں۔ میں نے کہا میاں عقل کی دوا کرو یہ لوگ صاحب کرم ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ تو غلط کہتا ہے یہ بندۂ درم ہیں۔ ان کی دولت سے کسی کو کیا فائدہ؟ یہ مانند ابر کے ہیں لیکن برستے نہیں۔ یہ مانند آفتاب کے

ہیں پر روشنی نہیں دیتے۔ یہ مقدور کے گھوڑے پر سوار ہیں پر اس کو چلاتے نہیں۔ خدا کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں چلتے۔ بغیر خوشامد کسی کو ایک دام نہیں دیتے۔ اگر دیتے بھی ہیں تو اشتہارِ خیرات کی آرزو رکھتے ہیں۔ روپیہ بڑی محنت سے جمع کرتے ہیں۔ اور پھر اس قدر کنجوسی کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ یہ سب مال و متاع بحسرت تمام چھوڑ جاتے ہیں۔ داناؤں کا قول ہے کہ خسیس کا روپیہ زمین سے اس وقت نکلتا ہے جب خود خسیس خاک کا بچھونا ہو جاتا ہے خسیس تمام عمر اپنا پیٹ کاٹ کر جمع کرتا رہتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اس کا مال دوسرے بے مشقت اڑاتے ہیں سہ

بہ رنج و سعی کسے نعمتے بچنگ آرد
دگر کس آید و بے رنج و سعی بر دارد

میں نے کہا آپ اپنی اصلیت پر آگئے ہیں شاید آپ کو گدائی کے ناگوار تجربات نے امیروں سے اس قدر کبیدہ خاطر بنا رکھا ہے آپ کو ان کی نعمت کا کیا وقوف ہے؟ بھائی صاحب جو شخص طمع کو یکقلم چھوڑ دے اس کے نزدیک کریم اور بخیل یکساں ہیں۔ سچ ہے کسوٹی جانتی ہے کہ سونا کیا ہے؟ اور سائل جانتا ہے کہ خسیس کون ہے؟ میرے مدعی نے جواب دیا کہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ دولتمند اپنے غریب خویش و اقارب کو گھر میں نہیں گھسنے دیتے اور غلیظ اور بے تمیز اشخاص کو دروازہ پر مقرر کر دیتے ہیں۔ ان کو ہدایت ہوتی ہے کہ کسی غریب رشتہ دار کو اندر مت آنے دو۔ میں نے کہا کہ بیچارے کیا کریں کہاں تک دیں؟ سائل کسی وقت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ہر وقت عرضیوں کے انبار اور درخواستوں کے طومار لگے رہتے ہیں۔ ان سائلین کی چشم طمع تو شائد اس وقت پُر ہو۔ جب ریگ بیابان موتی بنجاوے سه

دیدہ اہل طمع بہ نعمت دنیا
پُر نشود ہمچناں کہ چاہ بہ شبنم

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ وہ شخص جو سختی کشیدہ اور تلخی دیدہ ہیں حلال و حرام میں بوجہ حرص بہت کم تمیز کرتے ہیں۔ اور بے ساختہ افعال ناشائستہ ان سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولتمند جن کو خدا نے سب طرح کا مقدور دے رکھا ہے حلال و حرام میں بخوبی تمیز کرتے ہیں۔ آپ اسے تسلیم کریں گے کہ مفلس اور محتاج ہی زیادہ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چوریاں کرتے ہیں۔ ڈاکہ زنی، ٹھگی، بدمعاشی وغیرہ افعال ناشائستہ غریبوں ہی سے سرزد ہوتے ہیں، الحاصل شیخ اور درویش کا یہ دلچسپ مباحثہ دیر تک ارباب مذاق کی سامعہ نوازی کرتا رہا۔ جب درویش کے دلائل و براہان کا سرمایہ ختم ہو گیا تو دونوں قاضی کے پاس بغرض فیصلہ گئے۔ قاضی نے شیخ کی برجستہ تقریر سُن کر کہا کہ آپ نے دولتمندوں کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے اور درویشوں پر ظلم روا رکھا ہے آپ کو یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ جہاں گل ہے وہاں خار بھی ہے۔ جہاں شراب ہے وہاں خمار بھی ہے۔ جہاں خزانہ ہے وہاں مار ہم خزانہ بھی ہے جہاں دُرِ شاہوار ہے وہاں نہنگ مردم خوار بھی ہے۔ تمام دولتمند یکساں نہیں ہوتے۔ جس کے پاس دولت ہو یہ ضروری نہیں کہ وہ

ہمیشہ نیک بخت اور بافیض بھی ہو ؎

اگر ژالہ ہر قطرۂ دُر شدے

چو خرمہرہ بازار ازو پُر شدے

انسان وہ اچھا ہے جو درویش ہو مگر دولتمندوں کی سی ہمت رکھے۔ امیروں میں وہ بہتر ہے جو فقیروں کی فکر رکھے۔ اس کے بعد قاضی نے درویش سے تخاطب کیا کہ تو نے بھی مبالغہ سے کام لیا ہے بلاشبہ ایسے امرا بھی ہیں جن کو باؤ شما کا خیال نہیں ہے لیکن ایسے بھی تو دولتمند ہیں جن کے عالمگیر فیض نے بہت لوگوں کو شرمندۂ احسان بنا رکھا ہے۔ اس طرح قاضی نے دونوں کو واجب تنبیہ کر کے صلح کرا دی شیخ کی استعداد علمی اس مباحثہ سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ سعدی بلاشبہ علم و فضل کا آفتاب تھا۔ اگر ہم سعدی کو جامع علوم کہیں تو بے جا نہیں مؤرخین نے لکھا ہے کہ سعدی چھبیس ۲۶ زبانوں پر قادر تھا۔ چونکہ ساری عمر سیر و سیاحت میں گذری اس لئے جہاں گیا وہاں کی زبان سیکھ لی اور پھر اس زبان میں اس قدر مہارت پیدا کر لی کہ گویا یہی زبان سعدی کی مادری زبان ہے۔ علم تفسیر و فقہ اور حدیث میں وہ لاثانی محدث تھا شاعری میں اس کو ایشیا کا ہومر کہتے ہیں۔ حکمت میں کافی دسترس رکھتا تھا۔ وہ بہت بڑا فلسفی اور سائنس دان بھی تھا۔ خدا پرستی کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کو عبادت کا از حد ذوق تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کیسی مستانہ ادا سے کہتا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار   شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

سیاحت

سعدی علیہ الرحمۃ کی حیاتِ مقدس کا بہت بڑا حصہ سیر و سیاحت میں گزرا ہے۔ "سیاحت" ان بزرگوں کے لئے جو دل کی آنکھیں کھولکر دنیا کو دیکھا کرتے ہیں بلاشبہ مبارک و مقدس ہے۔ سیر و سفر انسان کو مستقل مزاج اور تجربہ کار بنا دیتا ہے۔ مشاہدہ قدرت بغیر سفر ممکن ہی نہیں۔ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ اگر بخوبی ہو سکتا ہے تو عالم اسباب اور کارزار ہستی کی گردآوری سے۔ صوفیائے کرام سب کے سب سیاح گزرے ہیں چنانچہ یہ قول آجتک مشہور ہے کہ صوفی دواں اور پانی رواں ہی اچھا رہتا ہے۔ اللہ میاں کی زمین تنگ نہیں ہے۔ پھر تم کیوں تنگ حلقوں میں محدود رہو؟ اللہ العالمین نے اس نظامِ عالم کو ہمارے مشاہدہ کے لئے بنایا ہے پھر اگر ہم اپنی ساری عمر بسم اللہ کے گنبد ہی میں گزار دیں تو ہماری بدقسمتی میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ درخت کا ہر سبز پتہ، جنگل کا ہر ایک درندہ، پہاڑ کا ہر ایک پتھر، ریگستان کا ہر ایک ذرّہ، سمندروں اور دریاؤں کی ہر ایک لہر، قدرت کی کھلی ہوئی کتاب ہے آؤ اور دیکھو، دیکھنے والوں کے لئے اس جہان میں بڑی ہی نشانیاں ہیں تدبر و فکر کرنے والوں کو ذرّے ذرّے میں اس کا نشان ملتا ہے۔ جب تم کسی بہت ہی اونچے پہاڑ کو دیکھو گے تو اللہ اکبر کہو گے جب تم کسی ہیبتناک بیابان سے گذرو گے تو العظمۃ اللہ کا ورد کرو گے۔ جب تم سمندر میں سفر کرو گے تو لاحول ولا پکارو گے۔ کیونکہ تمہارے نفسِ سرکش کو قدرت کی عریض و طویل نشانی مرعوب بنائے گی اور اس کا سر تسلیم خم کرائے گی۔

جو خوش نصیب افراد پہلے ہی سے اُس کے آگے جھکے ہوئے ہیں اُن کو راحت و سرور حاصل ہوگا۔ کہ ہمارا مولا کیسی کیسی عظیم نشانیاں رکھتا ہے سعدیؔ کی ساری عمر سیر و سیاحت میں گزری۔ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطہ مسعودی اور ابن العقل کے سوا شیخ سعدیؔ سے بڑھکر کوئی سیاح نہیں گزرا۔ شیخ مرحوم مشرق میں خراسان، ترکستانؔ۔ اور تاتار تک گیا ہے۔ بلخؔ و کاشغر میں بھی قیام رہا ہے۔ جنوب میں سومناتؔ تک آیا۔ اور سومنات سے ہندوستان کی سیر کرتا ہوا دریا کی راہ سے عرب کو چلا گیا۔ شمال مغرب میں عراق، عجم، عمان، عراق عرب، شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک میں بارہا سفر کیا۔ اصفہان، تبریز، بصرہ، کوفہ، بیت المقدس، طرابلس الشرق، دمشق، دیار بکر اور اقصائے روم کے شہروں میں آمد و رفت رہی۔ مغرب کی جانب عربؔ اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا ہوا۔ ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے یمن، صفا، حجاز، اسکندریہ، مصر، حبش میں بھی قیام کیا۔ بقول سر گور اوسلی، شیخ نے مشرق اور مغرب، جنوب اور شمال میں یکساں گرد آوری کی ہے، ایشیائے کوچک، بربر، حبش، مصر، شام فلسطین، آرمینیا۔ عرب، جملہ ممالک ایرانؔ، اکثر ممالک توران، ہندوستان، رودبار، ویلم، کاشغر، اور جیحون سے آگے تک بصرہ اور بغداد سے سرحد چین تک کی سیر کی۔ چار دفعہ ہندوستان میں قدم رنجہ فرمایا۔ "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" میں لکھا ہے کہ "شیخ مرحوم مدرسہ سے ۱۲۲۴ء میں رخصت ہو کر غالباً ۱۲۲۵ء ہریا ۱۲۲۴ء میں عازم ہند ہوا تھا۔ اور بلخ، غزنی، پنجاب اور گجرات

ہوتا ہوا سومنات چلا گیا تھا۔ سومنات میں چند روز مقیم رہ کر دہلی آیا دہلی سے رجعت کر کے یمن کو شرف اندوز قدوم فرمایا یمن سے حبش اور حبش سے افریقہ اور افریقہ سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حاضر ہوا اور پھر شام کو چلا گیا "چیمبرز انسائیکلوپیڈیا" میں لکھا ہے کہ شیخ مرحوم نے یورپ کے اکثر ممالک کی بھی سیر کی تھی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شیخ لاطینی اور فرانسیسی زبانوں پر قادر تھا۔ تو اس بیان کی صداقت میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ شیخ ایسے اولوالعزم سیاح کی وسعتِ نظر سے یورپ مخفی رہتا یہ ضرور وہاں گیا اور ان ممالک کی خوب سیر کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اپنے سفرِ یورپ کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ÷

شیخ نے آبی سفر بھی بہت کئے۔ خلیج فارس، بحر عمان، بحر ہند، بحیرہ عرب، بحر قلزم اور بحیرہ روم میں بارہا سفر کئے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بادشاہ کشتی میں سوار تھا اور اس کے ہمراہ ایک عجمی غلام تھا۔ غلام نے پہلے کبھی دریا نہیں دیکھا تھا۔ دریا کو دیکھتے ہی کانپنے اور شور و غل مچانے لگ گیا۔ اس کی بزدلی اور ہائے پکار نے بادشاہ کے لطفِ سفر و عیشِ صحبت میں بڑا خلل ڈالا۔ اور اس نے نہایت سراسیمگی سے کہا کہ کسی طرح اس نامعقول غلام کو خاموش کرنا چاہئے شیخ نے کہا جہاں پناہ! اگر ارشاد عالی ہو تو میں تعمیل حکم کر سکتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا بڑا ہی احسان ہوگا۔ سعدی نے حکم دیا کہ اس غلام کو پکڑ کر دریا میں غوطے دو۔ وہاں کیا دیر تھی! ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا اور لگے غسل آب دینے۔ غلام جب خوب غوطے کھا چکا تو شیخ نے کہا

کہ اب اس کو کشتی میں بٹھالو۔ چنانچہ ملاحوں نے اس کو کھینچ کر کشتی میں بٹھادیا اب نہ وہ روتا تھا نہ چیختا تھا۔ آرام سے چپ چاپ بیٹھا تھا، اس کی خاموشی سے بادشاہ متعجب ہوا۔ اور پوچھا کہ اس میں کیا حکمت تھی؟ سعدی نے کہا کہ قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید۔ اس حکایت کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ اُس کشتی میں سعدی خود موجود نہیں تھا۔ بلکہ اس نے ایک فرضی حکایت بطور تمثیل لکھی ہے لیکن دراصل اُس کشتی میں سعدی ہی سوار تھے۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو "حکیم" کے پردے میں رکھا ہے۔ اسی طرح گلستاں بوستاں وغیرہ میں کئی جگہ شیخ نے اپنے تجربات اور اپنے اقوال کو از راہِ کسر نفسی دوسروں سے موسوم کیا ہے۔ اس سے کسر نفسی بھی مقصود تھی اور لطافت کلام بھی کیونکہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

شیخ آذری نے اپنی کتاب جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی نے ہندوستان کا آخری سفر محض دیدار خسروؒ کی غرض سے کیا تھا۔ لیکن آذری کی یہ روایت ضعیف ہے۔ کیونکہ جب خسروؒ کی شہرت ہوئی ہے تو سعدی ضعیف ہو چکے تھے۔ اور اس عمر میں وہ زحمتِ سفر گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب مؤرخین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ شیخ نے چودہ پاپیادہ حج کئے تھے۔ جب ہم شیخ کے استقلال اور ان کی جفاکشی دیکھتے ہیں تو یہ کچھ عجب نہیں کہ چودہ حج کئے ہوں۔ آپ کی رگوں میں حُبِ دینی کا خون تھا۔ وہ اگر چودہ چھوڑ چودہ سو مرتبہ بھی شیخ کو آستانِ یار پر لے جاتا تو تھوڑا تھا۔ آپ نے سیر و سفر کی

بسم اللہ بھی حج سے ہی کی تھی۔ ابھی آپ کی عمر نو سال کی تھی کہ جب آپ قافلے کے ہمراہ حج کو گئے ہیں۔

عالم سفر میں شیخ نے صعوبتیں بھی بہت اُٹھائی ہیں۔ تقریباً ہر سفر میں آپ کو مشکلات کا سامنا ہوا کرتا پر آپ کے عزم صادق میں کبھی تزلزل نہیں آیا۔ شیخ کے وقائع سیاحت کو دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سیاحت آپ کے لئے ایک وسیع تجربہ اور مشاہدہ کا ذریعہ تھی۔ وہ اس عرصۂ ہستی کے ذرّے ذرّے کو دیکھتے تھے۔ اُن کی نظر دوربین کو کوئی چیز بیکار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ خشکی کے ہر ذرّے اور تری کے ہر قطرہ کی ماہیت دیکھتے تھے۔ تدبر کرتے تھے۔ عبرت پکڑتے تھے۔ اپنی معلومات کو وسعت دیتے تھے۔ وہ ہر حادثۂ عالم سے نتائج اخذ کرتے تھے۔ ڈائری لکھتے تھے تاکہ میرے ذاتی تجربات و مشاہدات سے ابنائے جنس ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہیں۔ مجالس العشاق میں لکھا ہے کہ شیراز کے حمام میں شیخ اور حکیم نزاری قہستانی ملاقی ہوئے۔ شیخ نے اپنے مکان پر بڑے تکلّف سے حکیم کی ضیافت کی۔ اور کئی دن مہمان رکھا۔ حکیم جب کھانے کے دستر خوان پر بیٹھا کرتا تو کہا کرتا "ہائے دعوتِ خراسان"۔ شیخ حیران تھا کہ میں بے انتہا تکلّف کرتا ہوں عمدہ اور نفیس کھانے دستر خوان پر لاتا ہوں پھر بھی یہ حکیم خراسانی دعوت کو یاد کرتا ہے خیر بات رفت گذشت ہوگئی۔ کچھ عرصہ کے بعد شیخ مرحوم کو خراسان جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے کہا آؤ اپنے قدیم یار حکیم نزاری سے بھی ملتے جائیں۔ اور یہ بھی دیکھیں کہ دعوت خراسان میں کیا شان ہے؟ شیخ نے حکیم کے ہاں تین وقت کھانا کھایا۔ پہلے روز سادی روٹی

اور معمولی ترکاری دسترخوان پر آئی۔ دوسرے روز بھُنے ہوئے پنیر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلا ہوا پارچہ اور خشکہ تھا۔ چلتے وقت شیخ نے از روئے مذاق کہا "ہائے دعوتِ شیراز" حکیم نے ہنس کر کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلفات کئے تھے اُس وقت مہمان بہت جلد بارِ خاطر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارا طریقہ ایسا ہے کہ اگر تمام عمر رہے تو مہمان کا رہنا ناگوار نہیں ہوتا۔ شیخ نے بھی اس بات کو تسلیم کیا۔ الحاصل شیخ کی تمام سیاحت تجربات سے مملو تھی۔ شیخ کی رائے میں سفر پانچ قسم کے اشخاص کو زیبا ہے +

اوّل دولتمند کو ؎

منعم بکوه و دشت و بیابان غریب نیست
هر جا که رفت خیمه زد و بارگاهِ ساخت

دوم عالم فاضل کو جو فصیح و بلیغ ہو ؎

وجودِ مردمِ دانا مثالِ زرِ و طلاست
که هر کجا که رود قدر و قیمتش دانند

سوم خوبصورت کو ؎

شاهد آنجا که رود عزت و حرمت بیند
در برانند بقهرش پدر و مادر خویش

پرِ طاؤس در اوراق مصاحف دیدم
گفتم این منزلت از قدرِ تو بے بینم بیش

گفت خاموش هر کس که جمالے دارد
هر کجا پائے نهد دست بدارندش پیش

چہارم خوش آواز کو ؎

چه خوش باشد آوازِ نرم و حزیں
بگوشِ حریفانِ مست صبوح

به از روئے زیباست آوازِ خوش
که این حظِ نفس است و آں قوتِ روح

پنجم صاحب ہنر یعنی اہل پیشہ کو ؎

گر بغریبی رود از شہر خویش سختی و محنت نبرد پارہ دوز
ور بخرابی فتد از ملک خویش گرسنہ خسپند ملک نیم روز

شہرت اور پبلک کا حسنِ ظن

ابھی شیخ مرحوم مدرسہ ہی میں تھے کہ آپ کی فصاحت و بلاغت کا شہرہ کاشغر تک پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ آپ کی شہرت نے ایران، ترکستان، تاتار، ہندوستان وغیرہ کو بھی تسخیر کر لیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کا کلام ایشیا یورپ اور افریقہ میں ترجمہ ہو کر نہایت قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا گیا۔ جو عام قبولیت شیخ کے نام اور کلام کو حاصل ہوئی وہ دنیا کے بہت کم شاعروں اور مصنفوں کے حصہ میں آئی ہے۔ شیخ مرحوم کی شہرت ان کے کلام کی جدت آفرینی کی رہین منت ہے۔ آپ انوکھے صاحبِ نظر تھے۔ آپ کو نظم و نثر میں یکساں دسترس تھی۔ جب ہم آپ کے مذاقِ سخن سے محفوظ ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچرل شاعری ہی آپ کی فطرت ہے۔ جب ہم آپ کے مقالاتِ نثر پر نظر کرتے ہیں تو لامحالہ لاجواب ناثر تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔ تاریخ کا ذکر آ جائے تو یہ ایک صاحبِ نظر مؤرخ دکھائی دیتے ہیں۔ تفسیر کا موقعہ آئے تو آپ ایک باخبر مفسر کی شکل میں جلوہ افروز ہیں۔ علم ادب کا بیان ہو تو آپ ایک فاضل ادیب تھے۔ فلسفہ کے میدان میں آپ فلسفی تھے۔ فقہا کے مجمعوں میں اعلیٰ پایہ کے فقیہ اور عرصۂ حدیث میں بے نظیر محدث و محقق، علم تصوف کے تو آپ مسلمہ جوہری تھے۔ کبھی دنیا نے آپ کو

ابوسعید ابوالخیر کے لباس میں دیکھا اور کبھی محی الدین عربی کے بھروپ میں،
شیخ کا یہ خاص اعجاز تھا کہ آپ قلم وزبان کے یکساں دھنی تھے جس طرح
آپ کا قلم پر زور تھا اسی طرح آپ کی زبان پرشور تھی۔ آپ کی تحریر اور تقریر
میں یکساں اثر تھا۔ آپ کی عذب البیانی اور طلاقت لسانی اور قلمی روانی
کا جواب نہیں ہے ؛

شیخ کی جادو بیانی کا مختلف ممالک میں اس قدر چرچا ہے کہ آپ کا
کلام مختلف ممالک میں ضرب الامثال ہو گیا ہے نصیحت کے وقت
لوگ جس تڑاقے سے شیخ مرحوم کے اشعار پڑھتے ہیں اور کسی شاعر کے
نہیں پڑھتے۔ خواہ کیسا ہی محل یا موقعہ ہو۔ شیخ کے کلام میں زمانہ کے
تغیرات، مشاہدات، تجربات کا بے مثل ذخیرہ ہے۔ شیخ کے دیدۂ احساس
نے زمانہ کے سب رنگ دیکھے ہوئے تھے۔ آپ کو عوام الناس کے
مذاق اور ان کے جذبات پر خاص قدرت حاصل تھی۔ وہ پبلک جذبہ
کی نہایت صفائی کے ساتھ تصویر کھینچ سکتے تھے۔ اور اسی لئے پبلک بھی
آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتی رہی۔ آپ کو روزانہ معاملات کا خاص علم تھا
اس لئے وہ جو کچھ کہتے تھے مناسب حال کہتے تھے۔ اور آپ کے بے تکلف
ارشادات سننے والوں کو تڑپا دیتے تھے۔ آپ کا کلام خود بخود دلوں پر
نقش ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے غیر فانی شہرت حاصل کی۔
اور آپ کا کلام مقبول عام ہوا۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے انسانی طبیعت کا بالخصوص
مطالعہ کیا تھا۔ اور وہ انسانی فطرت کے رمز شناس تھے۔ اسی لئے لوگ
آپ کو ترجمان اسرار اور لسان الغیب کہکر پکارتے ہیں ؛

شیخ کی مقبولیت کلام کی نسبت ایک روایت زبان زد خلائق ہے

کہ ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے یکایک کھُل گئے اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے۔ اس بزرگ نے حیران ہو کر دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ شیخ کی ایک بیت جناب الٰہی میں مقبول ہوئی ہے اور یہ اس بیت کا صلہ ہے۔ وہ بیت یہ ہے ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس عجیب ماجرا کے سنتے ہی وہ بزرگ خواب سے بیدار ہو گئے اور اسی وقت شیخ مرحوم کے عزلت خانہ پر یہ مژدہ جاں پرور سُنانے گئے۔ وہاں دیکھا کہ شیخ علیہ الرحمۃ چراغ جلائے بیٹھے ہیں اور جھوم جھوم کر کہہ رہے ہیں ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

الحاصل شیخ نے شہرت کی مملکت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بلا مزاحمت تسخیر کر لیا تھا۔ شیخ نے گلستاں کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عام افتاد و صیت سخنش کہ در زمین بسیط رفتہ" شیخ کا وجود خالص کندن تھا۔ سخن کے جوہری دل و جان سے آپ پر نثار تھے۔ جہاں آپ جاتے تھے قدر دانانِ کلام کو فرش راہ پاتے تھے۔ چونکہ شیخ کا پاکیزہ کلام اخلاق اور تہذیب نفس کے مقالات سے لبریز تھا اس لئے لوگوں کو ایک خاص ارادت اور غائبانہ حسن ظن ہو گیا۔ بڑے بڑے مغرور و سرکش پادشاہ آپ کے دیدار کو سعادت ابدی

سمجھتے تھے۔ اور آپ کے کلام کو متبرک و مقدس تسلیم کرتے تھے۔ شیراز کی حکومت جس شخص کو تفویض ہوتی تھی وہ آپ کا خاص احترام کرتا تھا۔ سرو آرا انکیانو (جس کو شیخ نے اپنی کلیات میں پند و موعظ کا مخاطب ٹھیرایا ہے) شیخ کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شیراز کے سپاہیوں نے شیخ کے بھائی کو (جو بقالی کی دوکان کیا کرتا تھا) کسی قدر آزردہ کر دیا۔ شیخ کو بھی اس معاملہ کی خبر ہو گئی آپ نے ایک شکایتی قطعہ وزیر کی خدمت میں بھیجا۔ جس میں اہل فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی بے نوائی کا تذکرہ تھا۔ وزیر نے فوراً اس امر کا تدارک کیا۔ اور خود شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی چاہی۔ اور ایکہزار درم پیش کر کے عرض کی کہ یہ حقیر رقم بطور ہرجانہ آپ کے بھائی کے لئے ہے۔ شیخ نے یہ رقم بھائی کے پاس بھیجدی۔ شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ شام۔ عراق عجم اور ہندوستان تک آپ کے احترام کا سکہ چلتا تھا۔ اور آپ کے حسن ظن کی دولت سعادت سے لوگ بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ کا یہ دستور تھا کہ راہ دعوت میں ما و شما کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ آپ کی زبان نصیحت دراز و بیباک تھی۔ وہ جس خلوص اور صفائی کے ساتھ غریبوں کو نصیحت کرتے تھے اُسی بے باکی کے ساتھ امیروں، وزیروں اور شہنشاہوں کو صراط مستقیم دکھلایا کرتے تھے۔ آپ کے اس جذبہ توکل کی سبب لوگ قدر کیا کرتے تھے۔ جہاں آپ کو غریب لوگ اپنا مخلص رہنما سمجھتے تھے۔ وہاں بادشاہ بھی مشیر با تدبیر سمجھتے تھے۔ اور سب حلقوں میں آپ کی یکساں عزت تھی۔ بقول علی بن احمد جس طرح شیخ آزادانہ طور پر پند و موعظت

پادشاہوں کو کیا کرتے تھے۔ وہ آجکل کے مشائخ ایک بقال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے آجکل کے ارباب تصوف نے راہِ عوت کو حمد تقدیس پر قربان کر دیا ہے +

شیخ کی عقیدت کے بارے میں بعض لوگ یہانتک بیان کرتے ہیں کہ ملتان میں رکن عالم صاحب نبیرۂ شاہ بہاؤالحق صاحب نے شیخ سے بیعت کی تھی۔ اور تصوف میں شیخ مرحوم ہی سے سبق لیا تھا۔ اور سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے خان شہید نے جو ناظم ملتان تھا۔ شیخ کو بارہا لکھا کہ جناب شیراز سے ملتان تشریف لائیں۔ اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے میرے مکانِ دل کو شادکام فرمائیں۔ ولیم اوسلی ایل ایل ڈی نے جو سر گور اسلی سفیر ایران کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا اپنے سفرنامہ ممالک مشرقیہ میں جو غالباً اس نے ۱۸۱۰ء میں تحریر کیا۔ لکھا ہے کہ ”شیراز میں جہاں نما کے قریب ایک مقام ہے جس کو چہل تن کہتے ہیں اور اس کے قریب ایک اور مقام ہے جس کو ہفت تن کہتے ہیں کیونکہ اس میں سات درویشوں کی قبریں ہیں اس مقام کے ساتھ ایک باغ ہے۔ جس میں بے شمار سرو کے درخت ہیں۔ ہفت تن کے ایک بالائی کمرہ میں سعدی اور حافظ کی تصویریں ہیں اگرچہ خیالی معلوم ہوتی ہیں مگر ایسے ملک میں بنائی گئی ہیں جہاں یہ دونوں صاحب کمال پیدا بھی ہوئے اور فوت بھی ہوئے پس ممکن ہے کہ ان کی کچھ نہ کچھ اصلی صورت کے ساتھ مشابہت رکھتی ہوں۔ شیخ کا مدفن اب تک ہزاروں معتقدین سعدی کا مرجع ہے۔ ہر چہار شنبہ کو مزار سعدی پر درویشوں کا میلا لگتا ہے۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ جب میں وہاں گیا تو درویش

بکثرت موجود تھے۔ شیخ کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ اب تک وہاں
میلہ لگتا ہے۔ اور نزدیک و دور سے لوگ آکر آستان بوسی سے شرف اندوز
ہوتے ہیں۔ وہ راستہ جو مدفنِ سعدی کو جاتا ہے شیخ ہی کے نام پر پل
سعدی کہلاتا ہے۔ سر ولیم یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کے مقبرہ کا جو بیرونی دروازہ
ہے وہ اس قدر نیچا ہے کہ میانہ قد کا آدمی بھی جھکے بغیر اندر داخل نہیں
ہوسکتا۔ اور یہ دروازہ دانستہ اس قدر نیچا رکھا گیا ہے تاکہ زائرین ادب سے
جھک کر اندر داخل ہوں۔ اور کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر اندر نہ آسکے
جس کے باعث بے ادبی ہو۔ لوگوں کے دلوں میں شیخ کی اس قدر
عظمت اور بزرگی ہے کہ مقبرہ کے ساتھ ایک چھوٹا سا تالاب ہے
جس کو ابتدا میں "قلات گازران" کہتے ہیں۔ مگر اب یہ سعدیہ کے نام سے مشہور ہے
اس تالاب میں طرح طرح کی مچھلیاں بکثرت ہیں۔ جن کے نتھنوں میں
بعض معتقدان شیخ نے سونے کی نتھلیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ کیا مجال
کسی کی جو وہاں سے مچھلی پکڑے یا ان مچھلیوں کو کسی قسم کی ایذا دے،
یعنی شیخ کی تقدس مآبی کا یہانتک شہرہ ہے کہ لوگوں کو ہر حال میں
ان کا ادب ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ جان ملکّس صاحب نے لکھا ہے
کہ بعض قدر دانان سعدی آپ کو ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ بھی
کیا ہے؟ ہمارے نزدیک بھی سعدی ولایت سے سرفراز تھے۔
ایک روایت بیان کرتی ہے کہ جب شیخ نے شہر سے باہر خانقاہ کی
عالیشان عمارت بنوائی ہے تو آپ دن رات وہیں رہا کرتے تھے،
اس خانقاہ میں بڑے بڑے شاہزادے، امراء اور سردار شیخ سے
ملنے آجاتے تھے، اور آپ کے لئے کھانا بھیجا کرتے تھے۔ آپ کا

یہ دستور تھا کہ روٹی کے تین حصے کیا کرتے تھے۔ ایک حصہ آپ
کھا لیا کرتے دوسرا حصہ فقیروں اور درویشوں کو دے دیا کرتے تھے،
ایک حصہ چھینکے پر جو دروازہ پر لٹکا کرتا تھا رکھ چھوڑتے۔ تاکہ غریب
لکڑہارے جب سارے دن کی محنت مشقت کے بعد بھوکے پیاسے
آئیں تو اس حصہ کو کھائیں۔ ایک دن ایک چور لکڑہاروں کا بھیس
کر کے وہاں آیا۔ جب اس نے چھینکے کے اندر ہاتھ مارا تو وہاں کسی چیز نے
زور سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چور نے ہر چند ہاتھ چھوڑانا چاہا مگر کچھ
پیش نہ گئی۔ ناچار ہو کر چور نے دوہائی دی۔ کہ شیخ صاحب للہ آئیے
اور مجھے چھڑائیے۔ شیخ مرحوم نے باہر آ کر پوچھا کہ تو کون ہے؟ چور نے
کہا کہ بندہ غریب لکڑہارا ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اگر تو لکڑہارا
ہے تو تیرے ہاتھوں پر کلہاڑی کے نشان کیوں نہیں ہیں؟ مجھے
معلوم ہے کہ تو چور ہے، سینہ زور ہے۔ اب اپنا زور لگاؤ تاکہ تمہاری
سینہ زوری دیکھی جائے۔ چور نے منت خوشامد کی اور آیندہ توبہ کی،
چنانچہ شیخ کے اشارہ پر چھینکے نے چور چھوڑ دیا۔ اس روایت سے شیخ کی
بزرگی اور حکمت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ شیخ کا چھینکا روحانی
تصرفات کی زنبیل نہیں تھا تو کم از کم شیخ مرحوم کی اعلیٰ حکمت کے سامنے
تو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ شیخ نے چھینکے میں ضرور کوئی حکمت
رکھی ہوگی جس سے لکڑہاروں کو آگاہ کر رکھا ہوگا۔ چور کو وہ حکمت
معلوم نہیں تھی۔ اس لئے اس کا ہاتھ پھنس گیا ہوگا۔

مانسر ڈیفریمری صاحب نے بھی شیخ کی بزرگی کا اعتراف کیا ہے
فاضل مانو پیٹری ڈی ساسیی صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ ہمیشہ اپنے

شخصوں سے سخت نفرت کرتا تھا جو زاہدوں کا لباس پہن کر لہو و لعب میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ شیخ کی بزرگی لوگوں کے دلوں میں اب تک اس قدر ہے کہ گلستاں اور بوستاں کو نستعلیق اور خوشخط سنہری و پہری حرفوں میں لکھوا کر اور بیش بہا جلدوں میں بندھوا کر اپنے کتب خانوں اور الماریوں میں رکھتے ہیں۔ لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں جہاں اس وقت ایک معقول ذخیرہ کتابوں کا موجود ہے داخل ہونے پر سب سے پہلے شیخ ہی کا شعر ایک چوب قلم سے لکھا ہوا نظر پڑتا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

صدیاں گذر گئیں۔ زمانے نے لاکھوں رنگ بدلے۔ وقت نے پلٹے کھائے۔ صفحۂ ہستی کے ورق الٹ گئے اور قانون قدرت کے دو ورق (زمین و آسمان) بھی ویسے کے ویسے نہ رہے۔ مگر گلستاں کے ورق الٹ کر دیکھو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ اُس وقت اپنی دلچسپ حکایتوں اور معنی خیز حکمتوں کے باعث مقبول خاص و عام اور واجب العمل تھی۔ ویسے ہی آج بھی دستور العمل بننے کے قابل ہیں۔ شیخ کی تصانیف نے قبولیت عام سے بقائے دوام ایک ایسا مرصع تاج شیخ کے فرق مبارک پر دھرا ہے جو سرمۂ اصفہانی اور شیرۂ شیراز کے ناموں کے ساتھ دنیا کے اختتام تک جائے گا۔ اور اس کی لسانی اور جادو بیانی نے شہرت عالمگیر کا ایک ایسا تو لکھا ہار اُس کے گلے میں پہنایا ہے جو قیامت تک سحبان اور سیسرو کے نام کی طرح سلامت رہے گا۔

رجعت اور وصال

بغداد میں جب شیراز کی یہ بلبلِ ہزار داستان اپنی زمزمہ سنجیوں سے قدر دانانِ سخن و کلام کو محفوظ و مسرور کر چکی تو رجعتِ وطن کا وقت آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سعد زنگی کا چراغِ حیات گُل ہو چکا تھا اور اس کے تاج و تخت کا وارث قتلغ خان اپنے ہیبت ناک نام کا سکہ جاری کر چکا تھا۔ سعدی جس نے فطرۃ انسان کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جذباتِ حُبُّ الوطنی سے کورا نہیں تھا۔ وہ وطن پرست تھا۔ اس کی فرصت کا ہر ایک ثانیہ یادِ وطن میں گذرتا تھا۔ وہ کہ حُبِّ وطن کو ملکِ سُلیمان سے خوشتر کہا کرتا تھا آخر بغداد کی مقدس صحبتوں سے بیزار ہو گیا بغداد میں سعدی کا احترام بھی تھا۔ سعدی کے ہم جلیس اور ندیم بھی تھے۔ اربابِ علم و فن کا جمگھٹا بھی تھا۔ الحاصل سعدی کے لئے بغداد میں سب کچھ تھا لیکن بغداد شیراز نہیں تھا۔ اور سعدی جس کی لَے خالص شیرازی تھی جس چیز کے لئے تڑپتا تھا وہ علم جغرافیہ کی رو سے ایران میں ہی میسّر ہو سکتی تھی۔ وطن کی حقیقی کشش واقعی عجیب ہوتی ہے۔ اِلٰہی کشش نے رجعتِ سعدی کا عنوان قائم کیا اور آخر کار سعدی شیراز کو چل کھڑا ہوا۔ جس وقت سعدی نے ایران کو چھوڑا تھا تو سلطان غیاث الدین اور اتابک ازبک وغیرہ حملہ آوروں نے اس علم پرور ملک کو ویران کر دیا تھا۔ اور اسی طوائف الملوکی بدنظمی، تنزلِ سیاسی نے سعدی کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اب فارس وہ فارس نہیں تھا۔ بربادی کی جگہ آبادی تھی۔ ویرانی و

خشکسالی کی جگہ شادابی تھی۔ طغیانی و سرکشی کی جگہ نظم وسکون تھا۔ قتلغ خان نے ایران کی کایا پلٹ دی تھی۔ شیراز کی خانقاہیں، عبادت خانے مدرسے اور مسجدیں جو پہلے حملہ آوروں کو بددعائیں دیا کرتی تھیں اب آباد و شاداب ہوگئی تھیں۔ اس نیکدل حکمران نے شیراز کے مدارس اور مساجد کے لئے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ شفاخانے بنوائے اور حاذق طبیب مقرر فرمائے۔ شیخ نے جب شیراز کو دوبارہ دیکھا تو حسب ذیل تبصرہ فرمایا ؎

ندانی کہ من در اقالیم غربت
چرا روزگارے بکردم درنگی

بدر رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم
جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی

ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن
چو گرگاں بخونخوارگی تیز چنگی

درون مردمے چوں ملک نیک محضر
برون لشکرے چوں ہژبران جنگی

چوں باز آمدم کشور آسودہ دیدم
پلنگاں رہا کردہ خوئے پلنگی

چناں بود در عہد اول کہ دیدم
جہاں پر ز آشوب و تشویش و تنگی

چنیں شد در ایام سلطان عادل
اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

شیخ نے دیکھا کہ اتابک ابوبکر میں جہاں رعایا نوازی، عدل گستری منصف مزاجی کے اوصاف حسنہ ہیں وہاں یہ عیب بھی ہے کہ فضلائے روزگار و علمائے نامدار کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتا ہے، اور جاہل درویشوں اور خانہ بدوش مجردوں کی عزت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بدگمانی کے باعث امام صدرالدین محمود، امام شہاب الدین توربشتی، مولانا عزالدین وغیرہ ہم ارباب علم و فضل نے راہ ہجرت اختیار فرمائی تھی اسی بدگمانی کے ہاتھوں اس پادشاہ نے قاضی عزالدین علوی جیسے

سندی سید کا مال و املاک ضبط کر لیا تھا۔ اپنے والد مکرم کے وزیر اعظم عمدالدین اسعد معہ اس کے فرزند تاج الدین محمد قلعہ میں کر دیئے گئے تھے۔ اور یہ وزیر با تدبیر قید ہی میں مر چکا تھا۔ شیخ نے جب دربار کا یہ عالم دیکھا تو گوشۂ عافیت میں ہی اپنی عافیت دیکھی ؎

ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را

شیخ دربار میں بہت ہی کم آیا جایا کرتے تھے ؛

اسی ابوبکر کی نسبت "تاریخ وصاف" میں ایک عجیب روایت لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک نیم ملا خطرۂ ایمان فضیلت مآب تقدس انتساب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے نہایت تعظیم و تکریم کی اور نماز کے وقت اُسے امام بنایا۔ نیم ملا نے قرأت کی کئی غلطیاں کیں، جس سے اتابک بہت خوش ہوا۔ اور اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کر کے رخصت کیا۔ اس سے ابوبکر کے مذاقِ علم و فضل کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس کے نقد و نظر کی وسعت آشکارا ہوتی ہے۔ ؎

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شیخ علیہ الرحمۃ کی معاودت کے بعد خواجہ علاؤالدین نے پچاس ہزار دینار بمنت شیخ کے حوالے کر کے ایک خانقاہ بنوادی تھی۔ یہ خانقاہ پہاڑ کے نیچے شہر کے گوشہ شمال و مغرب میں تیار کی گئی تھی سعدیؒ نے وطن میں آکر اشغالِ دنیاوی یکلخت ترک کر دیئے۔ آپ دن رات خانقاہ میں رہا کرتے تھے۔ مذاکرۂ تصوف میں مستغرق رہتے تھے۔ دنیا سے کنارہ کر لیا تھا۔ سکون و اطمینان کی اس فرصت میں

تصوّف کے حقائق و معارف خوب خوب حل کئے۔ اور آپ کے عقدہ کشائی کی دُور دُور دھوم مچ گئی۔ دیار و امصار کے اعوان و انصار آتے تھے۔ اور فیض صحبت سے مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ آپ نے علم و فضل کا سدا برت قائم کر رکھا تھا جہاں تشنگانِ رموز و نکات کو سب کچھ ملتا تھا +

آخر اس صاحبِ کمال پر بھی وہ وقت آیا جو سب پر آچکا ہے اور سب پر آئیگا۔ یہ ایسا وقت ہے جو کبھی وقت بے وقت نہیں دیکھتا یہ وہ پیامِ آخر ہے جو ہمارے جدِ امجد (آدم علیہ السلام) کو بھی سُنایا گیا تھا۔ پھر نوحِ عُمر بھی یہ وقت آیا تھا۔ ابراہیم و موسیٰ کی شمعِ حیات بھی اسی بے وقت کی آندھی نے گُل کی تھی۔ ہمارے آقائے نامدار سرورِ کائنات روحی فداہ کا بھی آخر وصال ہوا تھا۔ الحاصل اس وقت سے کسی کو مفر نہیں ہے، بڑے بڑے تاج داروں ریفارمروں، اوتاروں، رشیوں، منیوں، صوفیوں، عالموں کی گردنیں اس وقت آگے خم ہو گئیں۔ نظامِ عالم کی ہر جاندار شے اس وقت کی منتظر ہے۔ عرصۂ ہستی کا ذرہ ذرہ موت و فنا کے زیرِ نگیں ہے۔ آخر اُس سعدی پر بھی یہ وقت آیا جس نے دنیا کو علمِ اخلاق کے بڑے بڑے سبق پڑھائے تھے۔ جس نے گلستان و بوستاں کے ادبی باغ لگائے تھے۔ جس نے تصوف کے دریا بہائے تھے۔ جس نے دنیا کے ہر ایک نظارے پر مثلِ طور غش کھائے تھے۔ جس نے بڑے بڑے مغرور بادشاہوں کے سر جھکائے تھے۔ وہ سعدی جو اپنے روحانی آبِ حیات سے مردہ دلوں کو

زندہ کیا کرتا تھا۔ آخر خود زندگی کو جواب دے بیٹھا۔ شیراز کی صحبتیں ماتم کریں کہ آج اقلیم سخن و بیابان کا پادشاہ اُٹھ جانے کو ہے۔ دنیائے ادب و خیال ماتم کرے کہ آج اس کا والی واصل بحق ہو جانے کو ہے۔ تلامذۂ تصوف و شریعت روئیں کہ ان کا مرشد طریقت لباسِ ہستی اُتار پھینکنے کو ہے۔ عروسِ حسن و نزاکت ثقفِ سوگ ہو کہ اس کا ناظر و شاہد آج محو و گمنام ہونے کو ہے گلستانِ نظم دعوتِ خزاں کی فکر کرے کہ آج اس کی طوطی ہزار داستاں قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کو ہے۔ بوستانِ نثر سینہ کوبی کرے کہ آج اس کا مصوّر قلم توڑنے کو ہے۔ جذبات و احساسات عزاداری کریں کہ ان کا نقاش مٹ جانے کو ہے۔ جمعہ کے دن ستمبر مطابق شوال ۶۹۱ھ کے مہینے میں سعدی کی متبرک روح قیدِ عناصر سے آزاد ہو گئی۔ کسی شاعر نے تاریخ وفات اس طرح کہی ہے ؎

دُرِ بحرِ معارف شیخ سعدی | کہ در دریائے معنی بود غواص
مہ شوال روز جمعہ او جش | بداں درگاہ رفت از روئے اخلاص
پئے پرسید سال فوت گفتم | زخاصانِ خدا زاں تاریخ شد خاص

۱۸۰۶ء میں ولیم فرینکلن انگلستان کا ایک سیاح فارس گیا تھا اُس نے شیخ کے مزار کا نقشہ اپنے سفرنامہ میں بدیں الفاظ کھینچا ہے۔ شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک میل جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ اس کی عمارت مربع اور وسعت میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہے۔ قبر سنگین بنی ہوئی ہے۔ اس کا طول چھ فٹ اور عرض اڑھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم خط نسخ میں

کندہ ہے۔ جس میں شیخ اور آپ کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے۔ اور اس پر شیخ مرحوم کے دو اشعار خط نستعلیق میں لکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مفصلہ ذیل شعر ہیں۔ واللہ اعلم ؎

الا اے کہ بر خاک ما بگذری
بخاک عزیزاں کہ یاد آوری

کہ گر خاک شد سعدی اورا چہ غم
کہ در زندگی خاک بودست ہم

جب اس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے۔ زائرین جو دیار امصار سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ زائرین کے مطالعہ کیلئے ایک نسخہ کلیات نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر بہت سے فارسی شعر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ اشعار ان لوگوں نے لکھے ہیں جو دور دراز مقامات سے بہر زیارت آتے ہیں۔ شیخ کے مقبرہ کی عمارت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اور اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو یہ بالکل کھنڈر ہو جائیگی۔ اس مقبرہ کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں۔ جنہوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے۔ سر گور آوسلی صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۱ء کے شروع میں جبکہ جارج سوم شاہ انگلستان تھے میں بعہدہ سفارت پیغام لے کر فتح علی شاہ قاچار کیخدمت میں گیا تھا۔ اس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسٹر فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے۔ قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے۔ اور تمام عمارت

عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں وہاں تھے اب ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جاوے تو اس مقبرہ کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے۔ اور میری حُسنِ عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرکے شیخ کے مقبرہ کی مرمت کرا دوں۔ مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اُس وقت فارس کا گورنر تھا اس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا۔ اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اس مقبرہ کی مرمت کرا دونگا۔ آپ کیوں اس قدر تکلیف اُٹھاتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ میں شیخ کے مزار کی مرمت اسی اسلوب اور عمدگی سے کرا دونگا جیسی کہ کریم خاں زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ یہ ہماری علم دوستی اور اسلاف پرستی کا حال ہے۔ ہمارے ذوق سلیم کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔ زبانی لسانی کلام سعدی پر فریفتہ ہیں۔ اس کے نام اور کلام پر مٹے جاتے ہیں، اس کے پند و موعظت سے وجد میں آتے ہیں اُس کے عشق کی قسم کھاتے ہیں لیکن عمل و وفاداری کا یہ عالم ہے کہ اس کے ڈھیر کو بھی آسودہ نہیں کر سکتے؟ جس طرح ہندوستان میں بے شمار مزاراتِ اسلاف ہماری بے حسی اور بے غیرتی کا ماتم کر رہے ہیں اسی طرح شیراز میں سعدی اپنوں کی سرد مہری کے شکوے کر رہا ہے۔ کیا سعدی کے کلام کی قدردانی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے نشانِ مزار کو بھی میٹ دیا جائے؟ آہ اُس یورپین سیاح کا

جذبہ دیکھو جس کے دل پر ٹھیس لگی کہ باوجود غربت وطن مزار کی مرمت پر آمادہ ہوگیا اور شہزادہ بلند اقبال کے احساس غیرت کو دیکھو کہ انگریز کی آمادگی بھی اس کے دریائے خیر و کرم کو جنبش نہ دیسکی، وائے بر حالِ ما و بر مسلمانیٔ ما۔ شیخ کا مذہب جیسا کہ آپ کے کلام سے ثابت ہوتا ہے اہلسنت والجماعت تھا۔ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ آپ کا مذہب شیعہ تھا۔ مگر یہ غلط ہے شیخ کے سنت جماعت ہونے میں ذرا بھی کلام نہیں۔ سر گور اوسلی نے تو یہانتک لکھا ہے کہ شیخ مرحوم نے شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ سے بیعت کی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اوسلی صاحب کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کیونکہ شیخ سعدی کی ولادت سے پہلے حضرت عبد القادر جیلانی سنہ ۵۶۱ھ میں وفات پاچکے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شیعہ بے تبرا اور سُنی بے تعصب تھا۔ اور اس میں کلام نہیں کہ شیخ مرحوم کا مسلک صلحِ کُل تھا۔ آپ سب اخرقِ اسلام کے جذبات کی عزت کرتے تھے۔ حقیقتاً صوفیائے کرام کی ذات سے کسی کو رنج نہیں پہنچا کرتا۔ اور یہ مردانِ خدا سب کے محبوب ہوتے ہیں۔ مولانا حالی مرحوم نے سچ لکھا ہے کہ ہم ایسے شخص کو جو مقبول فریقین تھا ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے شیخ سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ وہ ظاہر داری اور ریاکاری سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ شیخ نے اپنے تقدس و احترام پر کبھی گھمنڈ نہیں کیا وہ اپنے آپ کو ایک بشر سمجھتا تھا اور کہا کرتا تھا ؎

کلیدِ درِ دوزخ است آں نماز ۔۔۔ کہ در چشمِ مردم گذاری دراز

تصانیف

شیخ علیہ الرحمۃ کا کلام بقول پروفیسر ایتھی سب سے پہلے شیخ علی بن احمدؒ نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس کے بعد مرتب کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ شیخ کی مکمل کلیات نہیں ہیں۔ یعنی علاوہ اس کلام کے جو علی بن احمدؒ نے جمع کیا شیخ کا اور بہت سا کلام تھا جو کسی نے جمع نہیں کیا۔ موجودہ مشہور کلام کی تفصیل یہ ہے:-

غزلیات۔ (۱) طیبات یعنی غزلیات کا پہلا دیوان (۲) بدائع یعنی غزلیات کا دوسرا دیوان (۳) خواتیم یعنی تیسرا دیوان (۴) مجموعہ غزلیات +

قصائد۔ (۱) قصائد فارسی (۲) قصائد عربی (۳) مراثی (۴) لمعات (۵) مثلثات (۶) ترجیعات (۷) مثنویات صاحبیہ۔ قطعات۔ رباعیات مفردات۔ مطائبات و ہزلیات۔ پندنامہ یعنی کریما۔ بوستان گلستان۔ رباعیات۔ ان رسالوں میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ اور عارفوں کی حکایتیں۔ اور بادشاہوں اور اعیان سلطنت کی نصیحتیں درج ہیں۔ علاوہ ازیں تقریباً سو تصانیف اور ہیں۔ جو ہندوستان میں زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ مثلاً بقول مسٹر ہمبرگ سعدی کی سب سے بڑی کتاب سلطنت عباسیہ کی چھ سو برس کی تاریخ ہے۔ جو ۱۶۸۱ء میں پہلے لاطینی میں ڈیو ڈ ہولے نے ترجمہ کی اور کنگ ایسٹن نے ۱۷۱۱ء میں پیرس میں ترجمہ کی۔ دوسری کتاب کا نام جزائر افریقہ ہے۔ اس کی بھی چار جلدیں ہیں وغیرہ وغیرہ

شیخ کی غزلیات کے بارے میں علی بن احمد کا خیال ہے کہ جب غزلیات مجالس سماع میں گائی جاتی ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ خاص وعام بے ہوش اور از خود فراموش ہو جاتے ہیں۔ مولینا عبدالرحمٰن جامیؒ شیخ کے کلام کی داد اس طرح دیتے ہیں ؎

در شعر ہمہ کس پیمبر انند ہرچند کہ لا نبی بعدی
ابیات وقصیدہ وغزل را فردوسی وانوری وسعدی

امیر خسرو دہلوی نے سعدی کے کلام پر حسب ذیل تبصرہ فرمایا ہے ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت شیرہ از میخانہ مستے کہ در شیراز بود

امیر خسرو خود بھی باکمال شاعر تھے۔ اس لئے ان کی رائے خاص معنے رکھتی ہے۔ خواجہ مجد الدین ہمگری کی رائے ہے ؎

ما گرچہ بہ نطق طوطئے خوش نفسیم بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم ہرگز من وسعدی بہ امامی نرسیم

اس رباعی کے متعلق ایک روایت بھی ہے جس کا ذکر اس موقع پر خالی از لطف نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان امیر معین الدین پروانہ حاکم روم، ملک افتخار الدین کریانی اور ملا نور الدین صدری باہم صلاح کر کے خواجہ مجد الدین ہمگر کے پاس آئے۔ خواجہ صاحب شیخ سعدی کے گرامی قدر معاصر تھے۔ سب نے آپ سے خواہش کی کہ سعدی کے کلام پر محاکمہ فرمائیے۔ جواب میں خواجہ ہمگر نے مندرجہ بالا رباعی پڑھ دی، رفتہ رفتہ یہ رباعی شیخ تک پہنچی۔ شیخ نے اس کے جواب میں یہ رباعی کہی۔ جو مشہور دوراں ہو گئی ؎

وہ رُباعی یہ ہے ؎

ہرکس بہ بارگاہ سامی نرسد — از بخت سیاہ و بد کلامی نرسد
ہمگر کہ بعمر خود نکردہ است نماز — شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

حاجی لطف علی خاں آذر کے نزدیک شیخ مرحوم پیغمبر غزل تھے۔ فردوسی، انوری، نظامی کے سوا کوئی ادیب و ناظم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حاجی موصوف کو مجد ہمگر کا امامی کو شیخ پر ترجیح دینا بھی ناگوار گذرا ہے۔ اور آپ نے یہ قطعہ کہکر دل کا بخار نکالا ہے ؎

یکے گفت امامی امام ہسری را — ز سعدی فزوں یافتہ مجد ہمگر
دریں ماجرا چیست رائے تو گفتم — ستمگر بود مجد ہمگر ستمگر

مسٹر جان پلیٹ (جو کسی زمانہ میں انسپکٹر مدارس ممالک متوسط تھے۔ اور جنہوں نے گلدستہ کا ترجمہ کیا ہے) نے لکھا ہے کہ سعدی غزل کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ اس پہلے کسی نے ایسے اشعار نہیں کہے جن کو واقعی "غزل" کہا جائے۔ شیخ کا دیوان "نمکدان شعرا" اور شیخ کا خطاب "بلبل ہزار داستان" ہے +

شیخ علیہ الرحمۃ نے اپنی جادو بیانی اور قادر الکلامی سے بلاشبہ غزل میں ایک نئی لذت پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ ظہیر، خاقانی اور انوری وغیرہ کی عمدہ غزلیات موجود تھیں لیکن شیخ کے کلام میں لطف ہی اور ہے۔ شیخ کی غزلیات مفصلہ ذیل خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہیں:-

(۱) شیخ کی غزلیات میں کلام کی سادگی سے قاری کو بہ آسانی کلام شیخ کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے سعدی کی غزلیات دل آویز اور

مرغوب خاص و عوام ہیں +

(۲) غزلیات میں زبان ایسی شستہ اور صاف استعمال کیگئی ہے کہ گویا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اور دل کے خیالات کو جو سب کی طبعیتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دیکر باتوں باتوں میں اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ باتیں مضمون بن گئی ہیں +

(۳) شیخ نے غزلیات میں بحریں ایسی اختیار کی ہیں جو تغزل اور تفنن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہیں یعنی شیخ کی غزلیات ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں اور کہیں آب حیات ہیں اس لئے سعدی کے منہ سے جو لفظ نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے +

(۴) غزلیات کے مضامین زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم شاعر کے لئے خیالی نہ تھے حالی تھے۔ جہاں کہیں دکھڑا رویا ہے وہاں ایسے مضامین استعمال کئے ہیں جس سے دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا ہوتا ہے۔ جن کے لفظ لفظ سے ناکامی اور زار نالے اور جن کے حرف حرف سے حسرت اور مایوسی ٹپکتی ہے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کا دل درد و غم کا مخزن، حسرت زدہ کا گورستان تھا۔ اور جو سننے والوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے ہیں۔ جہاں کہیں عیش و نشاط کے مضامین کر لیا ہے وہاں لفظ لفظ سے خوش طبعی اور حرف حرف سے ظرافت ٹپکتی ہے۔ اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے شرابِ ناب کے سرور میں گل افشانی کی ہے +

(۵) شیخ نے غزلیات میں فصاحت و سادگی پر ایک شوخی اور بانکپن کا انداز ایسا بڑھایا کہ جس سے پسند عام نے شہرت

دوام کا فرمان دیا ہے۔ جس سے عوام الناس ہیں دھوم مچ گئی اور خواص مان گئے کہ یہ طرز انہیں کی ایجاد ہے۔ اور انہیں پر ختم بھی ہے ✣

(۶) مضامین کی رنگینی اور محاوروں کی نمکینی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو زبان پر قدرت کامل تھی۔ یعنی شیخ کی غزلیات "تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی کی صفات سے متصف ہیں ✣

(۷) شیخ کی غزلیات ہر پہلو سے مرغوب طبائع خاص و عوام ہیں۔ درویش خصلت اور فقیر مزاج لوگوں کے لئے وہ ایک تصوف اور عرفان کا دریا ہیں۔ اور غیر متشرع رند مشرب اور آزاد لوگوں کیلئے ایک ہوش ربا میخانہ ہیں ✣

(۸) شیخ نے تشبیہ اور تمثیل سے غزلیات میں ایسی دستکاری اور مینا کاری کی ہے کہ اس سے لفظوں میں شوکت اور کلام میں بلاغت پیدا ہو گئی ہے۔ شیخ کی طبیعت عاشقانہ تھی۔ آپ نے عاشقانہ کلام کی بنیاد انسانی حسن وغیرہ اکثر پر ہی رکھی ہے۔ اسی بنا پر بعض لوگ سعدی پر حسن پرستی کا الزام لگاتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ "حسن پرستی" اگر جرم ہے تو بندگان مجاز کے لئے! ورنہ جو قلب صافی نیچر کا پرستار ہو اور ہر اچھی چیز دیکھ کر اس کے بنانے والے پر قربان ہونا چاہتا ہو اس کے لئے "حسن پرستی" سے بڑھکر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے! یہ وہ حسن پرست ہیں جن کی آنکھ صنعت کے پردہ میں صانع کو دیکھتی ہے۔ جذبات حیوانی و شہوانی کا یہاں کیا ذکر؟ نفس کی لذتوں سے کے تو یہی حضرات دشمن ہیں۔ تم جنگل میں جاتے ہو اور کسی سر سبز

درخت کی شادابی سے خوش ہوتے ہو تم باغ میں جاتے ہو وہاں طرح طرح کے پھل پھول تمہاری دیدہ فریبی اور قسم قسم کے طیور سامعہ نوازی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ تم دریا پر جاتے ہو پانی کی روانی اور مستی دیکھکر لوٹ جاتے ہو۔ کیا نیچر کی یہ خوبصورتی تمہیں موہ نہیں لیتی؟ اور کیا قدرت کی مینا کاری کا مشاہدہ جرم ہے؟ جب تم بے جان اشیا کی خوبصورتی کا لطف اُٹھا سکتے ہو تو جاندار انسانوں کے خط و خال کا مطالعہ کیوں گناہ ہے؟ سعدی قدرت کے حُسن کا بندہ تھا۔ وہ دنیا کی ہر ایک نزاکت میں اپنے مولا کی نزاکت، دنیا کے ہر ایک حسن میں حسین ازل کا جلوہ، دنیا کی ہر ایک ادا میں مالک کی رعنائی اور دلربائی دیکھتا تھا۔ وہ تصویر کو نہیں مصوّر کو پوجتا تھا وہ مے کو نہیں مے کش کو سجدہ کرتا تھا۔ وہ تصنیف کو نہیں مصنف کو ڈھونڈھتا تھا۔ وہ پلوں، نہروں، عمارتوں کو نہیں انجینئر کو دریافت کرتا تھا۔ غرضیکہ ہر ایک صنعت میں اس کو صانع کی جلوہ افروزی نظر آتی تھی۔ لیکن ساری دنیا کو سعدی کا سا قلب سلیم اور چشم حق بیں نہیں ملسکتی۔ اس لئے ظاہر بینوں نے اس کی حسن پرستی کا طنزیہ تذکرہ کیا ہے چنانچہ ایک انگریز مصنف جان پلیٹس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جو تبریز کے حمام میں پیش آیا تھا مصنف مذکور لکھتا ہے، سعدی (علیہ الرحمتہ) تبریز میں گیا تو اس نے حمام تبریزی کا بہت شہرہ سُنا۔ کسی ظریف نے یہانتک کہہ دیا کہ حمام کا ایک فرزند یوسف ثانی ہے۔ اپنے حسن و جمال کا جواب نہیں رکھتا پر حمام اپنے اس دلبند کو دنیا کی نظر سے محجوب رکھتا ہے چشم نظارہ ہمیشہ اس کی زیارت کو

ترستی رہی ہے۔ شیخ (کہ جو حسن و جمال کا پرستار تھا) یہ حالات سن کر
تصویر شوق بن گیا۔ لڑکے کی نسبت ایک غائبانہ حسن ظن پیدا ہوگیا
شیخ نے ارادہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اُس گلفام کی زیارت سے بہرہ اندوز
ہونا چاہیئے۔ چنانچہ شیخ پہلے ہی سے ایک حمام میں جاکر چھپ رہا
یہ وہ حمام تھا جس میں اس روز ہمام اپنے دلبند فرزند کے ساتھ آنیوالا
تھا۔ چنانچہ خواجہ ہمام اور اس کا لڑکا آئے اور جب حمام میں داخل
ہوئے تو شیخ بھی گلیم درویشی اتار کر سامنے جا حاضر ہوا۔ خواجہ ہمام
کو یہ مداخلت ناگوار گذری۔ اپنے لڑکے کو پیچھے چھپا لیا۔ اور لڑکے
کے آگے آپ کھڑا ہوگیا۔ پھر شیخ کو جھڑک کر بولا کہ تو کہاں سے
آیا ہے؟ شیخ نے جواب دیا خاک پاک شیراز سے! ہمام نے
جواب دیا کہ اس ملک میں شیرازی تو کتے کے برابر ہے۔ شیخ نے کہا
ٹھیک ہے مگر شیراز میں تبریزی کتوں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ اسی
طرح کچھ عرصہ تک شیخ اور خواجہ میں نوک جھونک ہوتی رہی
آخر خواجہ لاجواب ہوگیا اور منفعل ہوکر کہنے لگا کہ شیراز میں خواجہ
ہمام الدین کے اشعار بھی مشہور ہیں یا نہیں؟ سعدی نے کہا بیشک
مشہور ہیں۔ اور ایک مقطع پڑھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمام میرے اور
میرے معشوق کے درمیان ایک پردہ ہے مجھے اُمید ہے کہ بیچ میں
سے یہ پردہ ہٹ جائیگا۔ خواجہ ہمام نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ
سعدی ہیں۔ شیخ نے کہا ہاں مجھے سعدی ہی کہتے ہیں۔ اس پر خواجہ
نے معذرت کی۔ اور کہا معاف رکھئے میں نے آپکو پہچانا نہیں
تھا۔ اس کے بعد اس نے شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور اپنے لڑکے کو

شیخ کی دست بوسی کا اشارہ کیا۔ اور کئی دن تک مہمان رکھکر بڑی
عزت کی"۔ اس واقعہ سے بھی شیخ کا عرفان اور اس کے ضمیر کی پارسائی کا
ثبوت ملتا ہے اگر شیخ نفس پرست ہوتا۔ تو ممکن نہیں تھا کہ ایک نونہال
کی شاہد بازی اس کے صاحب احساس والا کی موجودگی میں کرتا اور
نہ ہی یہ ممکن تھا کہ خواجہ ہمام شیخ کی اس قدر عزت و حرمت کرتا۔ اصلیت
یہ ہے کہ شیخ حقیقت پرست تھا۔ وہ مجاز کو لیکر عشقِ حقیقی کا راستہ صاف
کیا کرتا تھا۔ جب ہم دقتِ نظر سے شیخ کی غزلیات پڑھتے ہیں تو
ان لوگوں کے عامیانہ مذاق کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جنہوں نے
شیخ پر امرد پرستی کا الزام لگایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شیخ کے تغزل
کی بنیاد امرد پرستی پر ہے تو یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کل ایران
کے شعراء کا مسلک یہی ہے اور آج ہماری اردو شاعری بھی انہیں
کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعروں نے
معشوق کو عورت باندھا۔ اور ہندی شاعری میں عورت کا عشق مرد کی
طرف جتایا جاتا ہے۔ مگر ایران والوں نے ایک روش بالکل نئی اختیار
کر لی۔ یعنی مرد کو مرد کا عاشق فرض کر لیا ہے عرب اور ہند کی شاعری یا
نیچر کے مطابق ہے۔ ایران کی شاعری بادی النظر میں خلاف فطرت
اور قبیح معلوم ہوتی ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ فارسی زبان میں عربی
اور ہندی کی طرح تذکیر و تانیث کی تمیز نہیں ہے۔ اس میں ضمائر
افعال اور صفات مرد عورت دونوں کے لئے یکساں لائے جاتے ہیں
اس لئے ممکن ہے کہ ایرانیوں نے بھی ہندی شاعری کی طرح اپنے آپ کو
عورت اور معشوق کو مرد قرار دیا ہو۔ قطع نظر اس کے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا

جائے کہ ایران والوں نے عاشقانہ اشعار کی بنیاد امردوں اور سادہ رخوں کے عشق پر ہی رکھی پھر بھی کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو فارسی میں شعر کہے وہ ضروری امرد پرست ہوا۔ یہ صرف ایرانیوں نے برائے نام عادتاً ٹھہرا لیا ہے۔ ورنہ یہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ اکثر شاعر جو پارسا اور پرہیزگار ہیں جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزہ چکھا ہے اور نہ اس کی بو تک سونگھی ہے سینکڑوں ورق شراب اور کباب کے مضامین میں سیاہ کر دیتے ہیں۔ اور ہزاروں پاکباز اور عفت مآب شاعری کی خاطر امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں ٭

مزید براں کسی پر عاشق ہونا یا کسی کو اپنا معشوق گردانا یہ معنے نہیں رکھتا کہ ضرور معشوق سے لذات نفسانی اور بہائمی کا پورا کرنا مقصود ہو۔ اگر عشق بازی کا مدعا صرف یہی ہے تو وہ عشق بازی صرف بوالہوسی ہے۔ اگر سچ پوچھو تو عشق مجازی عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہے عاشق کو معشوق کی صفات کا عشق ہوتا ہے نہ کہ اس کی ذات کا۔ مثلاً جو عاشق حسن جمال ہے وہ ہمیشہ حسن و جمال کی پرستش کریگا۔ خواہ اس کی جھلک عورت میں ہو خواہ مرد میں۔ بلکہ زیادہ تر مرد پر عاشق ہوگا کیونکہ اس میں گنہگاری کا بہت کم خطرہ ہے۔ اور عورت کے عشق میں جو قدرت نے مرد کے لئے وضع کی ہے خلاف شرع حرکت سے بہت ہی احتیاط سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ الحاصل سعدی ایک پاکباز عاشق تھا۔ اس کا عشق حقیقی تھا۔ وہ اگر خوبصورت چیزوں پر شیدا تھا تو کوئی اور چیز بہ جز کے نہیں تھا صرف صانع حقیقی کی پرستش مقصود تھی۔ ایسے عشق کی ہر ایک صوفی صافی قلب کو ترقئ باطن کے لئے ضرورت ہے۔ نا پاک عشق بازی، ریاکاری بوالہوسی

اور ہوا و ہوس سے وہ سخت متنفر تھا چنانچہ خود ایک موقعہ پر کہا ہے ؎

گر نظر صدق را نام گنہ مے نہند
حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

بوستاں

سعدی کا چمن نظم بوستاں کی مہک آفرینی سے ہمیشہ مہکتا رہیگا اگر سچ پوچھو تو شاہنامہ کے علاوہ کوئی اور فارسی کی منظوم کتاب ایسی مقبول و منظور نہیں ہوئی۔ بوستاں نے ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان، ہندوستان بلکہ یورپ تک سے خراج تحسین و ارادت وصول کیا، فضلائے روزگار نے اس ادبی بوستاں کو ہمیشہ سر آنکھوں پر جگہ دی ہے ایشیا والے تو بوستاں کے جواہر ریزوں سے محفوظ ہوتے ہی رہے ہیں یورپ کے قدر دانانِ سخن بھی اس کی بو باس سے محروم نہیں رہے ہے۔ سب سے پہلے ایک جرمنی فاضل (اوولے ایریس) نے بوستاں کا ترجمہ جرمن میں کیا۔ اس کے بعد ایچ گراف نے ۱۸۵۰ء میں بوستاں کا انگریزی ترجمہ کپتان ایچ کلارک رائل انجینیر نے ۱۸۷۹ء میں نہایت عمدہ اور مفصل کیا ہے۔ بعد ازاں میجر میکنن نے بوستاں کی چیدہ حکایات کا ترجمہ انگریزی نظم میں کیا ہے۔ اس منظوم ترجمہ کا نام "فلورم فرام دی بوستاں" رکھا ہے۔ سعدی کی یہ ادبی سوغات نہایت ہی مقبول و منظور ہوئی ہے باایں ہمہ اس کے مصنف کو اپنے عجز و انکسار کا اعتراف ہے اور اس نے بوستان کے دیباچہ میں بصراحت صاف لکھا ہے ؎

تو نیز سعدی بینی ام در سخن   بخلق جہاں آفریں کار کن

چو بیتے پسند آیدت از ہزار — بمردیکہ دستت ز لعنت بدار

شیخ نے بوستان ۶۵۵ھ میں لکھی تھی۔ سن تصنیف کا بھی دیباچہ میں حوالہ دیا ہے سے

ز ششصد فزوں بود پنجاہ و پنج
کہ پُر دُر شد ایں نام بردار گنج

بوستان اپنی ادبی نزاکتوں کے لحاظ سے ہی ایک دل آویز تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے طرز تحریر میں مفصلہ ذیل خصوصیتیں بھی ہیں۔ اور سچ پوچھو تو یہی خصوصیتیں اس لاجواب کتاب کا طغرۂ امتیاز ہیں:-

(۱) بوستاں کی ہر ایک حکایت معنے خیز ہے۔ اور اس سے کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے۔ مثلاً سے

حکایت

یکے پند مے داد فرزند را — نگو دار پند خردمند را
مکن جور بر خوردگاں اے پسر — کہ یکروز تا افتد بزرگی زسر
نمے ترسی اے کودک کم خرد — کہ روزے پلنگیت برہم درد
بخردی درم زور سرپنجہ بود — دل زیر دستاں ز من رنجہ بود
بخوردم یکے مشت زور آوراں — نکردم دگر زور بر لاغراں

(۲) بوستاں میں شیخ نے نیچرل (فوق العادت) باتوں کو تمثیل بنا کر نصیحت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ ایسی ایسی تمثیلیں لی ہیں جو روزمرہ مشاہدہ میں آتی ہیں۔ مثلاً سے

حکایت

برہ در یکے پیشم آمد جواں — بتگ در پیش گوسفندے رواں

بدو گفتم این ریسمانست و بند | کہ مے آرد اندر پئیت گوسپند
سبک طوق و زنجیر از و باز کرد | چپ و راست پوئیدن آغاز کرد
برہ ہمچناں در پئیش میدوید | کہ جو خوردہ بود از کف مرد خوید
چو باز آمد از عیش و بازی بجائے | مرا دید گفت اے خداوند رائے
نہ این ریسماں مے برد با منش | کہ احساں کمندیست در گردنش
بلطفے کہ دید ست پیل دماں | نیارد ہمے حملہ بر پیل باں
بداں را نوازش کن اے نیک مرد | کہ سگ پاس دارد چو نانِ تو خورد
براں مرد کندست دندانِ یوز | کہ مالد زباں بر پنیرش دو روز

(۳) بوستاں میں شیخ نے پند و موعظت میں کہیں کہیں ظرافت اور خوش طبعی کے نمک کی چاشنی بھی دیکر کلام کو چٹ پٹا اور مرغوب طبع بنایا ہے۔ درحقیقت "ظرافت" بھی ایک جائز حد تک کسی شاعر کے کلام کا جزو لاینفک ہے۔ بوستاں کی ایک حکایت ملاحظہ ہو ۔

حکایت

مرا حاجیے شانۂ عاج داد | کہ رحمت بر اخلاق حجاج باد
شنیدم کہ باری سگم خواندہ بود | کہ از من بنوعے دلش ماندہ بود
بینداختم شانہ کیں استخواں | نمے بایدم دیگرم سگ مخواں
مپندار چوں سرکہ خود خورم | کہ جور خداوند حلوا برم
قناعت کن اے نفس بر اندکے | کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش خسرو بحاجت بری | چو یکسو نہادی طمع خسروی

(۴) شیخ کو زمانہ سازی اور ریاکاری سے سخت نفرت تھی۔ آپ اخلاص کے پرستار تھے۔ ہمیشہ ظاہر پرستوں اور منافقوں کی خبر

لیا کرتے تھے۔ بوستاں میں بھی آپ نے ایسے عیاروں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ آپ کے نزدیک ان لوگوں کی کچھ قدر و قیمت نہیں تھی جن کا نفس تو باغی ہے جو اندر سے تو پلید ہیں۔ سیہ کار ہیں۔ پر ظاہر میں آنکھوں کا تارا بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں سے خراج عقیدت وصول کرنے کی نیت سے عابد شب دار بن جاتے ہیں۔ پر اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ بوستاں کی ایک حکایت میں فرماتے ہیں ؎

حکایت

شنیدم کہ مردے براہِ حجاز	بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز
چناں گرم رو در طریق خدا	کہ خار مغیلاں نہ کندے ز پائے
بہ آخر ز وسواس خاطر پریش	پسند آمدش در نظر کار خویش
بہ تلبیس ابلیس در چاہ رفت	کہ نتواں ازیں خوب تر راہ رفت
گرش رحمتے حق نہ دریافتے	غرورش سر از جادہ برتافتے
یکے ہاتف از غیب آواز داد	کہ اے نیک بخت مبارک نہاد
مپندار گر طاعتے کردۂ	کہ نزلے بدیں حضرت آوردۂ
بہ احسانے آسودہ کردن دلے	بہ از الف رکعت بہر منزلے

(۵) جہاں کہیں تشبیہ یا استعارہ استعمال کرتا ہے۔ وہاں نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے زود فہم اشیاء کو انتخاب کرتا ہے۔ تاکہ اس سے عبارت مبہم نہ ہو جائے۔ بلکہ مضمون کا زور دوبالا ہو جاتا ہے ؎

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت
درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

(۶) سعدی کے کلام کی ایک اور خوبی ہے کہ وہ بیہودہ الفاظ سے پرہیز

عموماً ایشیائی سخن سنجوں کو مبالغہ محبوب رہا ہے۔ دوسرے اسی مبالغہ کا ہمیں طعنہ بھی دیتے ہیں۔ لیکن سعدی کے کلام میں مبالغہ بہت ہی کم ہے سچ پوچھو تو سعدی کا زیور ہی اس کی سادگی ہے، مبالغہ میں تاثیر بہت کم ہوا کرتی ہے اور سعدی کو اسی لئے پرہیز تھا ؎

میانے دو کس دشمنی بود و جنگ ؎ سر از کبر بر یکد گر چوں پلنگ
نہ دیدار ہم تا بعدے زماں ؎ کہ بر دو ہر تنگ آمدے آسماں

(۷) شیخ صحیح معنوں "مصوّر فطرت" تھا۔ فطرت کی تصویر جس خوبی اور صفائی کے ساتھ سعدی نے کھینچی ہے ایسی اور کسی شاعر سے نہیں کھینچی گئی۔ شیخ نے قانون قدرت کو تعلیم اخلاق کے لئے ذریعہ ٹھیرایا ہے، تاکہ نصیحت جلا دل نشیں اور کارگر ہو مثلاً ؎

پلیدی کند گر بہ بر جائے پاک ؎ چو زشتش نماید بہ پوشد بہ خاک
تو آزادی از ناپسندیدہ ہا ؎ نہ ترسی کہ بر وے فتند دیدہ ہا

(۸) شیخ نے حسن تاویل اور لطف استدلال کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے ؎

شنیدی کہ در روزگار قدیم ؎ شدے سنگ در دست ابدال سیم
نہ پنداری ایں قول معقول نیست ؎ چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست

بادی النظر میں یہ بات فوق العادت معلوم ہوتی ہے کہ ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے ہیں۔ مگر شیخ نے اس کی نہایت خوبی کے ساتھ تاویل کی ہے۔ کہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں ان کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ اس سے شیخ کے کلام کی دل آویزی ثابت ہوتی ہے۔ اور اس باکمال "مصوّر فطرت" کا کمال +

(۹) شیخ نے واقعات کا بیان اس حسن و لطافت کے ساتھ کیا ہے کہ جس سے اس واقعہ کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اسی لئے تو دنیا نے آپ کے کلام پر حسن عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق | کہ یاراں فراموش کردند عشق
چناں آسماں بر زمیں شد بخیل | کہ لب تر نکردند زرع و نخیل
بخوشید سرچشمہ ہائے قدیم | نماند آب جز آب چشم یتیم
نبودے بجز آہ بیوہ زنے | اگر بر شدے دودے از روزنے
چو درویش بے برگ دیدم درخت | قوی بازواں سست و درماندہ سخت
نہ در کوہ سبزی نہ در باغ شخ | ملخ بوستاں خوردہ مردم ملخ

الحاصل سعدی کے اس لہلہاتے ہوئے ازلی بوستاں میں ایسے ایسے دل آویز اور دیدہ زیب پھل پھول ہیں جن کی مہک آفرینی سے دنیا کا مشام جاں آج تک معطر ہے۔ اس کی خوبیاں ابھی تک ویسی ہی ہے جیسی کہ سعدی کے وقت تھی۔ اور قیامت تک ایسی ہی رہیگی۔ بوستاں دنیائے ادب و خیال کی واقعی بوستاں ہے! چشم بد دور ۔

گلستاں

اب ہم شیخ کی اس بدیع المثال تصنیف پر دو حرفی تبصرہ کرتے ہیں۔ جس کی لاجواب لطافت بے مثال غرابت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے جس تصنیف نے سعدی کو خواص و عوام الناس سے روشناس کرایا ہے اور جس کلام نے ان کو طبقۂ خواص سے طغرائے امتیاز دلایا ہے وہ یہی گلستاں ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایشیا کے ہر طفل مکتب

کے ہاتھ میں گلستاں دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو بچے ابھی پرائمری مدرسوں میں پڑھتے ہیں وہ بھی شیخ کی گلستاں سے آگاہ ہیں، جس کسی کو دیکھو گلستاں کا شیدا ہے۔ معلوم نہیں گلستاں کی تحریر و تصنیف کس نیک وقت ہوئی تھی۔ شاید سعدی کو سحر نگار یا معجز رقم قلم مل گیا ہوگا۔ یا کسی اہل دل نے دعائے خیر دی ہوگی کہ گلستاں اس قدر مقبول و محبوب ہوگئی۔ بہرحال یہ تو سعدی کا اعجاز ہے کہ اس کی گلستاں نے ایک عالم کو موہ لیا۔ دنیا میں ہزاروں انقلاب ہوئے۔ کرۂ ارض پر تغیرات کی بارش ہوتی رہی۔ کبھی عباسیوں کا طوطی بولا۔ کبھی اُمیتوں کا سکہ چلا۔ کبھی افغانوں نے اقبال و شوکت کو غلام بنایا۔ کبھی مغلوں نے ڈنکا بجایا۔ کبھی نادر نے دنیا کو روندا۔ کبھی دُرانیوں نے کوس انا ولا غیری بجایا۔ کبھی ہندوؤں کا بول بالا ہوا۔ کبھی ترکوں کے گردشِ ابرو نے دنیا کو نیم جاں بنایا۔ دنیائے ادب و خیال میں بھی بے شمار انقلاب ہوئے روما، یونان، مصر اور ہندوستان بابل و بغداد کے بعد یورپ میں علم و ہنر کا نزول ہوا۔ ہزاروں فیشن بدلے۔ لاکھوں باکمالوں کا عروج اور کروڑوں نام آوروں کا خروج دیکھنے میں آیا۔ لیکن گلستاں کے سدابہار گلشن میں خزاں و افسردگی کا کبھی گذر نہیں ہوا۔ اس کی روشیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب ہیں۔ بوباس میں ذرا فرق نہیں آیا۔ رنگینی رعنائی، دلربائی ویسی ہی ہے، مقبولیت کا وہی عالم ہے۔ گلستاں اگر پرانے ملانوں (اولڈ فیشن) بزرگوں کے نزدیک ایک بابرکت کتاب ہے تو نئی لائٹ کے جنٹلمین بھی اس کے تقدیس و تمجید پر فدا ہیں۔ ان کی گردنیں بھی گلستاں کے آگے خم ہو رہی ہیں۔ سینا کے دلوں کو اس کے

مطالعہ سے حلاوت اور آنکھوں کو طراوت حاصل ہوتی ہے ❖

گلستاں کو شیخ کے تمام کلام کا خلاصہ ست یا عطر اگر کہیں تو بیجا نہیں ہے۔ کیونکہ گلستاں وہ دل آویز کتاب ہے جس میں اخلاق، شاعری نثر، سیاست، تصوف، شریعت، تمدن سب کچھ ہے۔ فارسی، انگریزی میں کوئی کتاب اس قدر مقبول و مشہور نہیں ہوئی۔ دوسرے مصنفین نے بھی ادبی باغ لگائے لیکن وہ سعدی کی گلستاں کا بھلا کب مقابلہ کر سکتے تھے؟ گلستاں اہل ذوق کے لئے روشنی کا ایک عظیم مینار ہے۔ یہ آسمانِ نظم ونثر کا وہ آفتاب ہے جس سے بے شمار ستارے اکتسابِ نور کرتے ہیں، گلستاں کی سیر کا شوق بچپن سے بڑھاپے تک برابر رہتا ہے۔ اس کی حلاوتِ روحانی عارضی ہیں۔ اس کی طراوت سے خشک سالی نے کبھی آنکھ نہیں ملائی۔ اس کی دائمی بہار کو خزاں سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ علم و دانش کا وہ خزینہ ہے جو ختم ہوا نہ ختم ہوگا۔ عبرت و موعظت کا وہ پیمانہ ہے جس کی مستانہ کیف میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ وہ کہ ایشیائی تصانیف کا تمسخر اڑایا کرتے ہیں۔ ذرا آئیں اور گلستانِ سعدی کی سدا بہار عطر بیزی دیکھیں قدرت کی نیرنگیوں کا یہ نقاد و ناظر بھی تو آخر اسی خاک پاک سے اٹھا تھا جس کو تم بہائم خیز کہتے ہو! اس کا کلام پڑھو۔ اور اپنی بے حسی و ناخلفی کا ماتم کرو۔ گلستاں کی مقبولیت کا یہ ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج تک اس کے تراجم دنیا کی تقریباً سب زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ گلستاں میں عجیب وغریب افسانے نہیں ہیں۔ اس میں گل و بلبل کے ترانے نہیں ہیں۔ اس میں عاشقانہ غزلیات نہیں ہیں۔ اس میں مہوشانہ اقوال نہیں ہیں۔ بااینہمہ دنیا اس کو عزیز رکھتی ہے۔ اس پر سب لوگ فریفتہ ہیں

اس نے عالمِ ادب و خیال کو تسخیر کر لیا ہے۔ لطف یہ کہ نہایت سادہ ہتھیاروں سے! فارسی کے علاوہ اب تک اس کے مفصلہ ذیل تراجم انطباع پذیر ہو چکے ہیں:-

(۱) جنٹس نے گلستان کا ترجمہ لٹن (لاطینی) زبان میں کیا۔ جو اٹسٹرڈم میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ÷

(۲) ہانسیر ڈوزایر کانسل مقیم اسکندریہ نے گلستاں کو فرنچ لباس پہنایا۔ یہ ترجمہ ۱۶۳۴ء میں پیرس سے شائع ہوا ÷

(۳) ایک دوسرے مترجم ہانسیر گاڈین نے ۱۷۸۹ء میں گلستاں کے خدوخال فرنچ میں نمایاں کئے ÷

(۴) ایک تیسرے مترجم مسٹر سماکٹ صاحب نے ۱۸۸۹ء میں گلستاں کا فرنچ ترجمہ پیش کیا۔ اور مقبول ہوا ÷

(۵) اولے آیرنس صاحب نے گلستاں کا جرمن ترجمہ شائع کیا۔ یہ باتصویر ترجمہ ۱۶۵۴ء میں بمقام ہیمبرگ شائع کیا گیا ÷

(۶) پھر مسٹر آرپی گراف صاحب نے ۱۸۴۶ء میں گلستاں کو جرمنی میں ترجمہ کیا ÷

(۷) ۱۶۵۴ء میں گلستاں کا ڈچ زبان میں ترجمہ کیا گیا ÷

(۸) مسٹر گلیڈون نے ۱۸۰۸ء میں اس کا انگریزی اڈیشن چھاپا ÷

(۹) بعد ازاں مسٹر راس صاحب نے حسب فرمائش ایشیاٹک سوسائٹی گلستاں کا انگریزی ترجمہ کیا ÷

(۱۰) ایسٹوک صاحب نے ۱۸۵۲ء میں بمقام ہرٹ فورڈ

گلستاں کو انگریزی سوٹ پہنایا۔ اس میں خوبی اور جدت یہ تھی کہ نثر کو نثری شکل میں ظاہر کیا گیا اور نظم کو نظم کا لباس پہنایا گیا۔ یہ واقعی عدیم النظیر ترجمہ ہے +

(۱۱) ۱۸۷۱ء میں جان پلیٹس انسپکٹر مدارس صوبجات متوسط نے گلستاں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا اور شروع میں حیات سعدی بھی لکھی +

(۱۲) ہندوستان میں سب سے پہلے میر شیر علی افسوس نے بعہد "مارکوئیس آف ویلزلی" گلستاں کا اردو ترجمہ کیا +

(۱۳) ایک بنگالی علم دوست نے اس کا بنگالی ترجمہ شائع کیا ہے +

(۱۴) ایک پارسی زندہ دل جنٹلمین نے اس کو گجراتی لباس پہنا کر اپنی علمدوستی کا ثبوت دیا ہے +

(۱۵) پنڈت مہر چند نے گلستاں کا بھاشا میں ترجمہ کیا اور اس کا نام پشپ بن رکھا ہے +

ان تراجم کے علاوہ گلستاں کے کئی ایڈیشن مختلف یورپین صاحبان نے چھپوائے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ مسٹر ہیرنگٹن نے ۱۷۹۱ء میں کلیات سعدی کی اشاعت کا فخر حاصل کیا +

(۱۶) جبرئیل نامی مصری ادیب نے گلستاں کا ترجمہ فصیح عربی میں کیا۔ اور یہ التزام رکھا کہ نثر کا ترجمہ نثر میں ہو اور نظم کا نظم میں +

(۱۷) سلطان حمید کے بھائی رشاد پاشا نے گلستاں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ قطع نظر ان کے سینکڑوں اور ترجمے گلستاں کے ہوئے ہیں معلوم ہوا ہے کہ ایک جنٹلمین نے اس کا روسی ترجمہ بھی شائع کیا ہے الغرض ہم کہاں تک شمار کریں دنیا کی تقریباً ہر زبان سعدی کی نکتہ سنجیوں سے

بہرہ اندوز ہو چکی ہے جس کو وکیھو جام سعدی کا پرستار ہے۔ دیکھئے مشاہیر عالم تصانیف سعدی خصوصاً گلستاں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ امیر حسن دہلوی فرماتے ہیں ؎

حسن گلے زگلستاں سعدی آوردہ است
کہ اہل دل ہمہ گلچین زیں گلستاں اند

سرگور اوسلی صاحب لکھتے ہیں "گلستاں کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جینیٹس نے لاطینی میں کیا تھا۔ مدتوں یورپ کے باذاق علم دوست ارباب نظر سے خراج عقیدت و ارادت وصول کرتا رہا ہے" پلیٹس صاحب لکھتے ہیں "کہ وہ کتاب جس نے سعدی شیرازی کے سر پر شہرت دوام کا تاج رکھا ہے گلستاں ہے" سر ولیم اوسلی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "شیخ کی عالمگیر شہرت کو اگر ہم ایک دل آویز عمارت سے تشبیہ دے سکیں تو بلاشبہ اس کی بنیاد گلستاں ہے" سر رابرٹ بننگ صاحب لکھتے ہیں "کہ سعدی غضب کا لکھنے والا شخص تھا۔ اس کی شوخی تحریر کا متاخرین تتبع کرتے رہے ہیں لیکن وہ رنگ پیدا نہیں کر سکے" قاآنی نے "پریشان" کے دیباچہ میں گلستاں کی نسبت لکھا ہے کہ "شیخ کی گلستان ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی ایک ایک پتی پر ہزاروں غلامان بہشت نثار ہیں اس کی حیات بخش خوشبو قیامت تک ارباب معرفت کی شامہ نوازی کرتی رہے گی"۔

گلستاں کی بوقلمونی مضامین بلاشبہ حیرت انگیز ہے۔ معاش و معاد دونوں کے طالب اس سے مفاد اٹھا سکتے ہیں۔ گلستاں اگر بچوں کی استاد شفیق اور رفیق طریق ہے تو جوانوں کی بھی ناصح شفیق ہے

اور ضعیف کبیر بھی اس کو نسخۂ کیمیا و زادِ راہِ عقبےٰ سمجھ کر چھاتی سے لگاتے ہیں بلاشبہ اس میں سب کچھ ہے۔ اگر الہامی کتب کی شہرت و عقیدت سے قطع نظر کر لی جائے۔ تو بلاشبہ گلستاں کی عدیم النظیر شہرت و ارادت پر ایمان لانا پڑے گا۔ گلستاں از فرق تا بقدم محامد و محاسن سے بھرپور ہے۔ تاہم اہل نظر نے "محاسنِ خصوصی" کے ذیل میں حسب ذیل جواہر ریزے منتخب کئے ہیں یہ ایسے جواہر ریزے ہیں جو تواتر و تسلسل زبان و قلم کی وجہ سے ضرب المثل بن گئے ہیں:

(۱) "حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را" (۲) "عاقبت گرگ زادہ گرگ شود" (۳) "آنانکہ غنی تراند محتاج تراند" (۴) "کوفتہ را نان تہی کوفتہ است" (۵) "کو خویشتن گم است کرا رہبری کند" (۶) "باطل است آنچہ مدعی گوید" (۷) "عطائے تو بہ لقائے تو بخشیدم" (۸) "مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں" (۹) "بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند" (۱۰) "ناز بر آں کن کہ خریدار تست" (۱۱) "نہ محقق بود نہ دانشمند، چارپائے برو کتابے چند" (۱۲) "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" (۱۳) "پراگندہ روزی پراگندہ دل" (۱۴) "قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید" (۱۵) "مور ہماں بہ کہ نباشد پرش" (۱۶) "گربہ مسکیں اگر پر داشتے تخم گنجشک از جہاں برداشتے" (۱۷) "کس نیاموخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد" (۱۸) "دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست" (۱۹) "در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس" (۲۰) "صیاد نہ ہر بارے شکارے ببرد- باشد کہ یکے روز پلنگش بدرد" (۲۱) "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" (۲۲) "کہ بسیار خوار است بسیار خوار" (۲۳) "بر رسولاں بلاغ باشد و بس" (۲۴) "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" (۲۵) "اندک اندک شود بہم بسیار" (۲۶) "جور استاد بہ ز مہر پدر" (۲۷) "خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی" (۲۸) "دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد"

(۲۹) سر ماندار ی سر خویش گیر" (۳۰) اگر خاکی نباشد آدمی نیست" +

باوجودیکہ سعدی کو سادگی پسند تھی۔ پھر بھی گلستاں کی عبارت خاص شان وشوکت کی مظہر ہے۔ اس مجلۂ ادبیہ کے آگے بڑے بڑے نثاروں نے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ بڑے بڑے اہلقلم سعدی کے اعجاز رقم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ سعدی نے حسنِ بیان کے جس چہرۂ زیبا سے نقاب اٹھایا ہے اس کے نظارہ کی ہر ایک آنکھ میں قدرت نہیں' گلستاں کا موضوع خالص اخلاقی و روحانی ہے۔ اور یہ وہ لائن ہے جو اپنے ذائقہ کی سادگی اور عدم نمکینی پر ہمیشہ حسرت کے آنسو بہاتی رہی ہے۔ لیکن سعدی کا اعجاز دیکھئے کہ اس روکھے پھیکے میدان میں بھی فصاحت اور بلاغت کے جوہر دکھا گیا ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چاشنیٔ مضامین ناولوں اور ناٹکوں تک ہی محدود ہے وہ اپنے اس خیال کی اصلاح کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ کیونکہ سعدی نے باوجود نہایت ہی بے تکلف طرزِ تحریر اور سادہ موضوع کے گلستان کو اس قدر مرغوب طبائع بنا دیا ہے کہ بائد و شائد۔ سچ ہے جس کو خدا خوبی دے اس کو زیورات کی کیا حاجت +

گلستاں کے اشعار' فقرات اور ابیات کو اہل قلم بزرگوں نے اپنی تصانیف میں بطور "کوٹیشن" استعمال کر کے اپنے کلام کی شان دو بالا کی ہے۔ سعدی حقیقت میں ترجمان اسرار تھا، پیغمبر سخن تھا۔ اس کی زبان و قلم سے جو ایک صاف لفظ نکل گیا وہ کیوں نہ شریعتِ سخن و کلام میں ممتاز جگہ حاصل کرتا۔ اس کی تقلید میں بھی ایجاد کا مزہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں سعدی کو مبالغہ سے نفرت تھی

وہ سخنورانِ مشرق کے اس نقص عظیم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے کہ ان کو مبالغہ بے حد محبوب ہے۔ اور واقعات کی تصویر کھینچنے سے اُس وقت تک معذور رہیں جب تک کہ مبالغہ کی پیروی نہ کریں۔ یورپین حضرات اس بات کا ہمیشہ طعنہ دیتے رہے ہیں۔ سعدی نے گلستان میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا کہ کوئی بات ایسی نہ لکھی جائے جس پر غلو اور فوق العادت کے الفاظ چسپاں ہو سکیں۔ جب ہم گلستان کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سعدی نے جو کچھ لکھا ہے بیساختہ اور طبیعت پر زور ڈالے بغیر لکھا ہے۔ گلستاں کے نصف سے زیادہ فقرے مسجع اور مقفےٰ ہیں۔ یہ صنعت لطف انگیز ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں پایا جاتا کہ سعدی کی تحریر نیرنگی آورد ہے۔ اور کہ اس نے طبیعت پر زور ڈال کر لغت پیمائی کی ہے۔ سعدی کی جودت طبع نے بلا تکلف الفاظ کے غنچے ملا دیئے ہیں۔ اور اس دل آویز گلدستہ کی ترتیب و تکمیل میں اُسے گلہائے رنگارنگ کی جھلک آفرینی کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ خود بخود ذہن رسا کے فرشتے ہاتھ باندھے سامنے حاضر تھے۔ گلستاں کے ملاحظہ سے سعدی کی دقت نظر کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ شیخ نے ہر ایک مسئلہ پر نہایت گہری بحث کی ہے۔ بال کی کھال نکالی ہے۔ اور تمام باتوں سے دقیق معنے اخذ کئے ہیں۔ اور ان معانی کو عام فہم پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ معمولی لیاقت کے لوگ بھی مطلب سمجھ سکیں۔ گلستاں میں شیخ نے قانون قدرت کو تعلیم و تربیت کا ذریعہ ٹھیرایا ہے۔ گلستاں میں شیخ نے یہ خوبی رکھی ہے کہ جب کسی خاص فرقہ کو اُس کے عیوب پر

متنبہ کرنا چاہا ہے تو اپنے آپ کو مشارٌ الیہ بنا کر اپنی ہی سرگذشت لکھنی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ اس حکمت عملی سے اس کی کتاب ہر فرقہ اور ہر گروہ میں ہر دلعزیز ہو گئی ہے۔ اور اس میں جو نصیحتیں ہیں وہ کسی کو بھی ناگوار نہیں گذریں۔ قصہ مختصر فقروں کی برجستگی، الفاظ کی شستگی، استعارات کی نفاست اور تشبیہات کی لطافت، پند و موعظت کی خوبی۔ مضامین کی ندرت اور دلفریبی حسن بیان، لطف ادا احسن تاویل اور حکمت استدلال یہ سب اوصاف گلستاں میں موجود ہیں۔ ان خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے ہمارا حسن ظن تقاضا کرتا ہے کہ سعدی کے اس لہلاتے ہوئے سدا بہار چمن کو "باغ بہشت" کہیں، سعدی کا یہ وہ باغ بہشت ہے جس میں سینکڑوں علم و فن کی نہریں ہیں جس میں ذوقِ معرفت کے لاکھوں پیڑ ہیں، روحانی شہد اور ادبی دودھ یہاں پانی کی طرح رواں ہے۔ آب حیات کے فوارے اس گلستانی چمن کو سرسبز رکھتے ہیں۔ پتے پتے پر معرفت کردگار کے ہزاروں دفتر نمایاں ہیں۔ دنیا میں دو قسم کے اشخاص ہیں ایک تو وہ ہے جن کو قلب سلیم ملا ہے۔ یہ منصف مزاج اور حق پسند بزرگ ہیں۔ یہ دوسروں کے کمال سے محظوظ ہوتے ہیں، ایک وہ بدقسمت پلید ہیں جن کی بدبختی دوسروں کے کمال سے ہر وقت نالاں رہتی ہے۔ یہ ہمیشہ حسد و بغض کی آگ سے جلتے ہیں۔ ہمیشہ اسی تلاش میں رہتے ہیں کہ باکمالوں کے نقائص بر سر عالم لاکر کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ اسی قماش کے لوگوں کی بدبین نظروں میں گلستاں بھی خارستاں بن کر کھٹک رہی ہے۔ ان لوگوں نے جس قدر اعتراضات

اس مقدس کتاب پر کئے ہیں سب کے سب بے معنی ہیں۔ ارباب نظر ان اعتراضات کو بالکل فضول قرار دے چکے ہیں۔ درحقیقت یہ اعتراضات کچھ بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ شیخ نے گلستاں کی پہلی حکایت میں "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" لکھا ہے اور کہ جھوٹ کبھی مصلحت آمیز نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ معترضوں نے شیخ کے مطلب کو نہیں سمجھا۔ شیخ کے آٹھویں باب کو بھی دیکھو جس میں اس نے ذاتی اعتراض کے لئے جھوٹ بولنے کو بہت برا بتایا ہے۔ شیخ نے اس حکایت میں یہ بتایا ہے کہ اس خاص موقعہ پر جھوٹ بولنا سچ سے بہتر تھا۔ اور وہ موقعہ ایسا تھا کہ جھوٹ بولنے سے جوانمردی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس اعتراض کی نسبت اسی قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ زمانہ کے احساس نے روزمرہ کے واقعات سے اس اعتقاد کی فلاسفی اور صداقت الم نشرح کر دی ہے۔ شیخ کے ایک دوسرے شعر پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے
ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

معترضین کہتے ہیں کہ اگر اس مضمون کو مسلمہ تصدیق کر لیں تو تعلیم و تربیت، قانون و مذہب اور تمام سیاستیں فضول اور بیکار ہوتی ہوتی ہیں۔ یہ بات من و عن درست ہے۔ تعلیم اور تربیت سے جبلت صرف عارضی طور پر بدل جاتی ہے۔ اور جو اصلیت ہے وہ کبھی زائل نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک یورپین شکاری نے

ایک بہت چھوٹا بچہ چیتے کا جنگل میں پکڑا۔ اور اُسے کُتے کی طرح دودھ سے پرورش کیا۔ اور گوشت کی بُو تک نہ سُنگھائی۔ آخر یہ بچہ جب بڑا ہو گیا تو اس شکاری کے ساتھ ساتھ کُتے کی طرح رہتا تھا اور تمام خصلتیں کُتے کی اس میں موجود تھیں۔ لوگ یہ معاملہ دیکھکر سخت حیران ہوتے تھے ایک دن شکاری گھر میں بیٹھا ہوا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور یہ چیتا پاس بیٹھا ہوا کُتے کی طرح اس کا پاؤں چاٹ رہا تھا۔ چیتے کی زبان خاردار ہوتی ہے چاٹتے چاٹتے شکاری کے پاؤں سے خون نکل آیا۔ چیتے کے مُنہ میں خون لگنا تھا کہ اسکی جبلت اس میں عود کر آئی۔ فوراً غرانے لگا اور دُم اُٹھا اُٹھا کر زمین پر مارنے لگا آنکھیں مشعل کی طرح روشن ہو گئیں اور قریب تھا کہ شکاری پر حملہ آور ہو اور ایک دو سکنڈ میں اس کو پھاڑ ڈالے مگر خوبیٔ قسمت سے وہاں ایک بھری ہوئی بندوق رکھی تھی جو شکاری نے معاً اُٹھالی اور چیتے کے مُنہ میں داغ دی۔ اور اس طرح جان بچائی ورنہ کام تمام ہونے میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ ع

ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

شیخ نے اپنے شعر میں "کل شئے یرجع الیٰ اصلہ" کی صحیح تفسیر کی ہے اور معترضین نے شیخ کا مفہوم سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ گلستاں میں شیخ نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

در اشنا نہ کنمیں نہیچ زرہ تمد
گماں مبر کہ بہودی شریف خواہد شد

یعنی یہودی کیسا ہی دولتمند ہو جاوے۔ شریف نہیں ہو سکتا
اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس بات سے کمال تعصب مترشح ہوتا ہے لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس میں کچھ بھی تعصب نہیں ہے۔ کیونکہ یہودیوں سے ہر جگہ نفرت کی جاتی تھی۔ چنانچہ کئی دفعہ انگلستان سے جلاوطن کئے جا چکے تھے، شکسپیر کا مشہور ڈراما شائلاک ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودی کیسی نفرت سے دیکھے جاتے تھے اگر شیخ نے بھی ان کی نسبت یہ لکھ دیا تو کیا برا کیا۔ اُس زمانہ میں یہودی طرح طرح کے افعال شنیع کرتے تھے اور ہر جگہ حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ہمارے رسول کریم صلعم کا بھی ارشاد ہے کہ یہودی ایک "بدبخت قوم ہے" قطع نظر اس کے فاتح قوم مفتوحہ قوم کو ہمیشہ حقیر ہی سمجھتی رہی ہے۔ پھر اگر شیخ نے ایک اصلیت عمومی کا ذکر کر دیا تو کیا برا کیا۔ سعدی کی پاک صاف ضمیر تعصب سے کبھی پلید نہیں ہوئی۔ وہ تعصب سے کوسوں دور تھے۔ تعصب تنگ خیالوں کا مذہب ہے۔ اہل دل بزرگ باؤشما کی تمیز نہیں کیا کرتے۔ سعدی کا سینہ صاف تھا۔ اس کی نظر میں گبر و یہود ہندو مسلم برابر تھے۔ وہ ایمان و خلوص کا خریدار تھا۔ اگر یہ صفات کسی میں نظر آتی تھیں تو فوراً بگڑ جاتا تھا۔ اور تنبیہ سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی مخلصانہ تنقید و تعریض کا نشانہ جب سلاطین اسلام تک رہ چکے ہوں، تو یہود کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بہر حال یہ اعتراض بھی واقعیت سے مبرا ہے
ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سعدی نے گلستاں میں "سرہنگ زادہ

دیدم کہ بر در سرائے غلمش" لکھا ہے اور کہ اغلمش کوئی بادشاہ نہیں ہؤا۔ اس کے جواب میں اول تو ہم یہ اختلاف لفظی پیش کرتے ہیں کہ شاید اغلمش سے مراد التمش ہوگی۔ دوسرے اگر یہ تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئیے کہ سعدی کی گلستان کوئی ہسٹری نہیں ہے کہ اس میں مصنف اپنی تاریخ دانی کی حفاظت کرے۔ ایک اعتراض کا مفاد یہ ہے کہ "شیخ نے گلستان میں لکھا ہے کہ ایک مریض بادشاہ کیلئے اطبائے وقت نے ایسے آدمی کا پتا جو اوصاف خصوصی رکھتا ہو تجویز کیا تھا۔ اور کہ یہ بات زمانہ حال کی تحقیقات نے بعید از صداقت ثابت کردی ہے۔ اور کہ اس سے سعدی کے عامیانہ مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو اس میں سعدی کا ذرا بھی قصور نہیں ہے مجوز نسخہ حکیم تھا نہ کہ سعدی ؟ اگر نسخہ تجویز کرنے میں غلطی ہوئی ہے تو وہ حکیم سے ہوئی ہے نہ کہ غریب سعدی سے؟ دوسرے اگر سعدی نے بنا بر نصیحت یہ فرضی حکایت بھی لکھدی تو کیا گناہ کیا؟ شیخ کا مقصد اصلی مدنظر رکھنا چاہئیے۔ شیخ کا نصب العین عبرت و نصیحت تھا نہ کہ فن طب و حکمت کی تدوین۔ ایک اور اعتراض ملاحظہ ہو۔ شیخ نے گلستان میں لکھا ہے ؎

راہ راست برو اگرچہ دور است
زنِ بیوہ مکن اگرچہ حُور است

اس پر اعتراض یہ ہے کہ جب بیوہ سے شرعاً شادی جائز بلکہ مستحسن ہے تو اس سے منع کرنے کے کیا معنے؟ ہم کہتے ہیں کہ شیخ

نے بیوہ سے مراد بیسوا عورت لی ہے۔ اور یہ تسلیم شدہ ہے کہ بیسوا عورتیں کبھی وفادار ثابت نہیں ہوئیں۔ اور جن لوگوں کو ان بیواؤں سے سابقہ پڑا ہے وہ سعدی کے فتوے کی قدر و قیمت سے بخوبی آشنا ہیں۔ دوسرے سعدی نے اپنا ایک خیال ظاہر کیا ہے اور احکام خدا اور رسول کی تردید یا مخالفت نہیں کی۔ اور وہ کیوں کرتے جب کہ ان کے زیر تالیف فتاوئی عالمگیر نہیں بلکہ گلستاں تھی۔ اب ایک اور اعتراض کا نمبر آتا ہے گلستاں میں لکھا ہے ؎

نہ بر اشتر سوارم نہ چو شتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

اس پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اعتراض ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ ناموزوں شعر ہے حالانکہ معترضین اپنے آپ کو سعدی کا نقاد بھی ظاہر کرتے ہیں پر ان کی دقتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ اس کے بحر سے بھی واقف نہیں ہیں۔ بھلا سعدی جس نے ایسے ہزاروں شعر کہہ ڈالے کبھی کوئی ادبی غلطی کا ارتکاب کر سکتا ہے؟ یہ شعر بحر رمل مجنوں فعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن سے ہے الحاصل گلستاں پر جس قدر اعتراض کئے جاتے ہیں سب کے سب فضول اور بے معنی ہیں۔ اور یہ ہوتا ہی آیا ہے کہ اچھی سے اچھی چیز کے بھی نکتہ چین لوگوں نے برے پہلو دکھلائے ہیں۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ محمودِ روزگار اصحاب کبار کے ضرور منہ آتا ہے۔ سعدی تو بھلا آخر ایک درویش گلیم پوش ہی تھا

حضرت انسان کے غلط اور حاسد نقد و نظر سے تو صحائف الہامی اور مرسلان ربانی بھی محفوظ نہیں رہے +

سعدی! تجھ پر ہزاروں درود وسلام، تو نے مذاقِ سخن کی وہ تواضع کی ہے جس کے احساس تشکر سے قیامت تک ہم سبکدوش نہیں ہونگے۔ تیرے گلستان اِخلاق و بوستان اخلاص میں شریعت و طریقت ہمیشہ کے لئے بغلگیر ہیں۔ اُس مخلوق عظیم کی خاطر جس کے حقیقی درد نے تجھے کبھی خاموش نہ ہونے دیا اللہ العالمین تیری روح پر اپنا فضل نازل کرے۔ آمین +

حیاتِ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی بیوی تھیں۔ عورتوں میں سب سے اول آپؓ ایمان لائیں۔ آپؓ نے اپنا تن من دھن سب کچھ اس داعی صادق پر قربان کر دیا۔ جسکے نام ایں ہم لوگونکی بیماریونکی شفا اور حاجتوں کی قضاء ہے۔ آپؓ کو یہ شرف حاصل تھا۔ کہ انکی زندگی میں حضرت رسالتمآبؐ نے دوسری شادی نہ کی۔ اسلام سے پہلے اگر رسول خداؐ قریش میں امین کے لقب سے ملقب تھے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ طاہرہ کے خطاب سے مخاطب کی جاتی تھیں اس پاک بی بی کے مقدس حالات جسقدر سبق آموز ہو سکتے ہیں وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ مولٰنا سید عاشق حسین صاحب سیمابؔ وارثی اکبرآبادی نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور آپؓ کے حالات زندگی میں یہ جامع کتاب لکھی جس کی نظیر کم سے کم اُردو زبان میں اس سے پہلے نہیں۔ شروع کتاب میں مزار حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا فوٹو بھی لگا دیا گیا ہے۔ قیمت بلا جلد ۱۲) مجلد ولائتی کپڑے کی جس پر کتاب اور مصنف کا نام سنہری حرفوں سے چھپا ہوگا صرف (عہ) علاوہ محصول ڈاک +

ملنے کا پتہ

مینیجر رسالہ صوفی پنڈی بہاؤالدین (ضلع گجرات)